PHONE : 7300

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

طلوع اسلام

ستمبر 1959ء

بتقریب جشن عید میلاد النبی (صلعم)

خاک کے ذرات کا منتہیٰ، اپنے ارتقائی مراحل طے کر کے، پیکر انسانی میں جلوہ بار ہونا ہے۔ اور انسان کا معراج کمال، شرف و مجد کے تمام منازل طے کر کے، سیرت محمدیہ کے مقام محمود تک پہنچنا۔ صفحۂ ارض پر، نہ اس سے آگے کوئی منزل ہے، نہ اس سے بلند کوئی مقام۔

خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست — رحمۃً للعالمینی انتہاست

معراج انسانیت — پرویز — صفحہ ۷۲۹

شائع کردہ :

ادارہ طلوع اسلام ۲۵۔ بی گلبرگ لاہور

قیمت بارہ آنے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

بدلِ اشتراک
ہندوستان اور پاکستان سے: آٹھ روپے
غیر ممالک سے: ۱۴ شلنگ

قیمتِ فی پرچہ
ہندوستان اور پاکستان سے:
بارہ آنے

ٹیلیفون:- ۷۵۰۰
خط و کتابت کا پتہ:- ناظم ادارہ طلوعِ اسلام
۲۵- بی- گلبرگ کالونی- لاہور

جلد ۱۲ | ستمبر سنہ ۱۹۵۹ء | نمبر ۹

فہرستِ مضامین

لمعات		۲ — ۱۱
شکریہ	(محترم پرویز صاحب)	۱۲ —
گرہائے عقیدت		۱۳ — ۲۸
حقائق و عبر		۲۹ — ۳۲
اسلامک آئیڈیالوجی	(محترم پرویز صاحب)	۳۳ — ۵۱
بزموں کے نمائندوں کا اجتماع		۵۳ —
قرآن کے صحائف	(محترم لطیف الرحمٰن صدیقی)	۵۵ — ۷۴
رابطۂ باہمی		۷۶ — ۷۸

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

لمعات

آزادی ——— بتقریب جشنِ عید میلاد النبیؐ

دنیا میں وہ کون سی چیز ہے جس کی انسان کو سب سے زیادہ خواہش رہتی ہے؟

آپ تاریخ کے اوراق کو الٹیئے۔ اقوامِ گذشتہ کے احوال و کوائف پر نظر ڈالیئے۔ دورِ حاضر کی مختلف تحریکوں کا مطالعہ کیجئے آپ دیکھیں گے کہ ایک ہی خلش ہے جس نے انسان کے دل کو شروع سے آج تک طلسمِ پیچ و تاب بنائے رکھا ہے ایک ہی تڑپ ہے جس نے اس پر راتوں کی نیند اور دن کا چین حرام کر رکھا ہے۔ وہ خلش ہے آزادی کے حصول کی آرزو۔ وہ تڑپ ہے اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کی تمنا۔ انسان نے ہمیشہ آزادی کی دیوی کی پرستش کی ہے۔ اس نے اس کے بڑے بڑے مجسمے تراشے ہیں۔ اس کے چرنوں (قدموں) میں ہمیشہ اپنی شردھا (عقیدت) کے پھول چڑھائے ہیں۔ اس کے حضور اپنی عقیدت مندیوں کے گیت گائے ہیں۔ اس کی خاطر بڑی بڑی قربانیاں دی ہیں۔ اس کے نام پر انسان نے اتنا خون بہایا ہے کہ اس کا عشرِ عشیر بھی کسی دوسرے جذبے کے حصہ میں نہیں آیا ہوگا۔ اسے انسان نے ہمیشہ اپنی متاعِ عزیز سمجھا ہے اور اس کے تحفظ کے لئے وہ اپنا سب کچھ قربان کر دینے کے لئے ہر وقت تیار رہتا ہے۔ یہ کچھ انسان شروع سے کرتا چلا آیا ہے اور یہی کچھ آج کر رہا ہے۔

لیکن آزادی کی اس قدر اہمیت کے باوجود انسان آج تک یہ نہیں متعین کر سکا کہ آزادی کہتے کسے ہیں؟ آپ نے وہ واقعہ سنا ہوگا کہ ایک ملک کو جب پہلے پہل آزادی ملی تو صبح سویرے ایک بڑھیا گھر سے نکلی اور سڑک کے بیچوں بیچ چلنا شروع کر دیا۔ کسی نے ٹوکا تو اس نے کہا کہ آج آزادی ہے۔ جہاں کسی کا جی چاہے چلے۔ وہ ابھی اپنا فقرہ پورا بھی نہ

کرنے پائی تھی کہ پیچھے سے ایک سائیکل سوار نے ٹکر لگائی اور بڑھیا دہ گری۔ اس نے گالیاں دینی شروع کیں تو سائیکل سوار یہ کہتے ہوئے آگے نکل گیا کہ آج آزادی ہے۔

آپ نے دیکھا کہ آزادی کا یہ مفہوم کس قدر غلط ہے۔ آزادی، پابندیوں کے توڑنے کا نام نہیں ہے۔ اس سے پھر وہی سوال سامنے آجاتا ہے کہ آزادی ہے کیا؟ اگر آزادی میں پابندیاں باقی رکھتے ہیں تو وہ آزادی نہیں رہتی اور اگر پابندیاں اٹھادی جاتی ہیں تو اس سے انارکی پھیل جاتی ہے۔

قدیم زمانے میں آزادی کا کوئی تصور ہی نہیں تھا۔ "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" اُس دور کا آئین تھا جس نے قوت فراہم کرکے حکومت حاصل کرلی اس کی اطاعت لوگوں کا شعار ہوگیا۔ یہ دورِ ملوکیت تھا۔ بادشاہ ڈنڈے کے زور پر اپنا حکم منواتا تھا اور مذہبی پیشوائیت اُسے ایشور کا اوتار یا ظل اللہ علی الارض (زمین پر خدا کا سایہ) بتاکر اس کی فرماں پذیری کی گرہیں مضبوط کرتی رہتی تھی۔ اُس دور کو ہم دَورِ جہالت و وحشت کہتے ہیں اور اپنے زمانے کو دورِ تہذیب۔ لیکن اگر ذرا بہ نگاہِ تعمق دیکھا جائے تو جہاں تک حکومت اور آزادی کا تعلق ہے، ہمارے دور اور اقوامِ سالقہ کے دورِ جہالت میں کچھ زیادہ فرق نہیں۔ فرق اگر کچھ ہے تو لباس اور پیکر کا ہے۔ روح آج بھی وہی کارفرما ہے۔ ہم اپنے زمانے میں آزادی سے مفہوم یہ لیتے ہیں کہ اپنے ملک پر اپنی حکومت ہو۔ یہ ٹھیک ہے کہ اپنے ملک پر اپنی حکومت بہت بڑی چیز ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا محض اتنی بات کہ اپنے ملک پر اپنی حکومت ہے کسی دوسرے ملک کے رہنے والوں کی حکومت نہیں، آزادی کی ضمانت ہوسکتی ہے؟ واقعات بتلاتے ہیں کہ ایسا نہیں ہوتا۔ ہمارے زمانے میں (اپنے ملک میں اپنی) حکومت کے بالعموم دو طریق رائج ہیں ایک طریق ڈکٹیٹرشپ کا ہے جس میں اقتدار ایک فرد کے ہاتھ میں رہتا ہے جو قوت کے بل بوتے پر لوگوں سے اپنی من مانی کراتا ہے۔ اس کے برعکس دوسرا طریق وہ ہے جسے جمہوریت کہتے ہیں۔ اس میں ایک پارٹی کسی نہ کسی طریق سے اکثریت حاصل کرلیتی ہے اور وہ محض اپنی تعداد کے زیادہ ہونے کی بنا پر، اقلیت سے جو جی میں آئے منوا تی ہے۔ اس کے پاس اپنی حکومت کے لئے اتھارٹی یہ ہوتی ہے کہ

(۱) ملک میں اقتدارِ اعلیٰ (SOVEREIGNITY) عوام کو حاصل ہے۔

(۲) عوام اپنے اس اقتدار کو اپنے نمائندگان کی وساطت سے بروئے کار لاتے ہیں۔

(۳) اس مقصد کے لئے عملی مشینری یہ ہے کہ عوام کے منتخب کردہ نمائندگان کی اکثریت کا فیصلہ، عوام کے اقتدارِ اعلیٰ کا مظہر سمجھ لیا جائے۔

ان مفروضوں میں کس قدر بنیادی غلطیاں ہیں، اگر ہم ان کی تفصیل میں چلے گئے تو ہم اپنے موضوع سے دور نکل جائیں گے۔ اس مقام پر اتنا بتادینا کافی ہوگا کہ خود مغرب کے مفکرین، مقننین اور سیاست داں "اقتدارِ اعلیٰ" کے اس نظریہ کو بھی غلط قرار دے رہے ہیں۔ اور جمہوری انداز حکومت کے ہاتھوں تنگ بھی آچکے ہیں۔ اس نظریہ کے متعلق پروفیسر الفریڈ کوبن

(ALFRED COBBAN) اپنی کتاب (THE CRISES OF CIVILISATION) میں لکھتا ہے کہ

اس نظریہ کو اگر بنظرِ امعان دیکھا جائے تو "عوام کے اقتدارِ اعلیٰ" کا فریب نکھر کر سامنے آجاتا ہے ..... اس نظریہ کی تائید میں روایتی دلیل بس یہ دی جاتی ہے کہ حکومت یا تو قوت سے قائم کی جاتی ہے یا باہمی رضامندی سے۔ اور چونکہ یہ غلط ہے کہ جس چیز کو قوت صحیح کہے وہ صحیح ہو۔ اس لئے یہی درست ہے کہ حکومت کو باہمی رضامندی پر مبنی ہونا چاہیئے۔ لیکن یہ دلیل نہ تو منطقی طور پر صحیح ہے۔ نہ ہی صداقت پر مبنی۔ اگر کسی غلط بات کو لاکھ آدمی بھی صحیح کہدیں تو وہ صحیح نہیں ہو سکتی..... فیصلہ وہی صحیح ہو سکتا ہے جو درحقیقت صحیح ہو نہ کہ وہ جسے زیادہ لوگ صحیح کہنا شروع کردیں۔

("انسان نے کیا سوچا" صفحہ ۱۸۵)

جمہوریت کے متعلق مشہور مفکر (RENE GUENIN) لکھتا ہے۔

اگر لفظ جمہوریت کی تعریف یہ ہے کہ لوگ خود اپنی حکومت آپ قائم کریں تو یہ ایک ایسی چیز کا بیان ہے جس کا وجود ناممکنات میں سے ہے اور جو نہ کبھی پہلے وجود میں آئی ہے اور نہ آج کہیں موجود ہے ایسا کہنا ہی جمع بین النقیضین ہے کہ ایک ہی قوم بیک وقت حاکم بھی ہو اور محکوم بھی..... حاکم اور محکوم کا تعلق دو الگ الگ عناصر کے وجود کا متقاضی ہے۔ اگر حاکم نہیں تو محکوم بھی نہیں۔ ہماری موجودہ دنیا میں لوگ (کسی نہ کسی طرح) قوت اور اقتدار حاصل کر لیتے ہیں۔ ان کی سب سے بڑی قابلیت اس میں ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کے دل میں یہ عقیدہ قائم کردیں کہ (ان پر کوئی حاکم نہیں بلکہ) وہ خود اپنے آپ پر حاکم ہیں..... عام رائے دہندگی کا اصول اسی فریب دہی کی خاطر وضع کیا گیا ہے اس اصول کی رُو سے سمجھا یہ جاتا ہے کہ قانون اکثریت کی مرضی سے وضع ہوتا ہے اور اس حقیقت کو نظرانداز کر دیا جاتا ہے کہ اکثریت کی یہ مرضی ایسی شے ہے جسے نہایت آسانی سے ایک خاص رُخ پر بھی لگایا جا سکتا ہے اور بدلا بھی جا سکتا ہے۔ (ایضاً صفحہ ۱۸۹)

ان تصریحات[1] سے واضح ہے کہ ذہنِ انسانی حکومت کا جو بہترین نقشہ مرتب کر سکا ہے اس میں بھی انسانی آزادی کا کیا حشر ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ مسئلہ ہے ہی ایسا مشکل اور نازک کہ ذہنِ انسانی اس کا اطمینان بخش حل دریافت نہیں کر سکتا۔ اس کے لئے اسے وحی کی راہ نمائی کی ضرورت ہے۔ قرآن نے اس مسئلہ کا حل آج سے چودہ سو سال پہلے پیش

---

[1] جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، اس مقام پر ہم زیادہ تفصیل میں نہیں جا سکتے۔ کسی دوسرے وقت "ہم" قرآن کے نظریہ سیاست و حکومت کے سلسلے میں ان امور پر سیر حاصل بحث کریں گے۔

کیا تھا، جب آپ اس پر غور کریں گے تو یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجائے گی کہ ان مقامات میں وحی کی راہ نمائی ہی صحیح راہ نمائی ہو سکتی ہے۔ جہاں تک انسانی آزادی کا تعلق ہے وہ یہ کہہ کر اس کی پوری پوری حفاظت کر دیتا ہے کہ

> مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ...... (۳/۷۹)
>
> کسی انسان کے لئے یہ جائز نہیں کہ خدا اسے کتاب اور حکومت اور نبوت دے اور وہ لوگوں سے یہ کہے کہ تم اللہ کے نہیں بلکہ میرے محکوم بن جاؤ۔

اس انقلاب آفریں اعلان میں، قرآن نے کہدیا کہ کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں کو اپنا محکوم بنائے۔ اس اصولی اعلان کی رُو سے جہاں "ایک انسان" (بادشاہ یا ڈکٹیٹر) کا حقِ حکومت ختم ہو جاتا ہے۔ وہاں "انسانوں کی جماعت" (جمہوری نظام کی اکثریت) کا حقِ حکومت بھی باقی نہیں رہتا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر حکومت کا حق نہ ایک فرد کو حاصل ہے، نہ افراد کی جماعت کو، تو کیا قرآن لاملکی یا لاحکومتی معاشرہ" (STATE - LESS SOCIETY) کا تصور پیش کرتا ہے؟ جی نہیں۔ وہ انسانی آزادی کے لئے آئینی، قانونی مملکتی معاشرہ کا وجود ناگزیر سمجھتا ہے۔ مندرجہ بالا آیت میں اس نے "مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ" کی استثنار (EXCEPTION) سے اسی حقیقت کو واضح کیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ حکومت کا حق انسانوں کو نہیں، بلکہ خدا کو ہے۔ "خدا کی حکومت" سے ذہن فوراً تھیاکریسی (THEOCRACY) کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ لیکن قرآن تھیاکریسی کی بھی سخت مخالفت کرتا ہے۔ "تھیاکریسی" میں مذہبی پیشوا (یا ان کی تائید سے، بادشاہ) خدائی اختیارات (DIVINE RIGHTS) کے حامل سمجھے جاتے ہیں اور وہ دوسرے انسانوں سے "خدا کے نام پر" اپنے فیصلے منواتے ہیں۔ قرآن کی رُو سے، کسی انسان کو "خدائی اختیارات" حاصل نہیں ہوتے۔ اس کی رُو سے قائم شدہ معاشرہ میں مذہبی پیشواؤں کا وجود نہیں ہوتا۔

تو پھر "خدا کی حکومت" کس طرح قائم ہوتی ہے؟ خدا نہ براہِ راست انسانوں کے سامنے آتا ہے نہ انھیں براہِ راست کوئی حکم دیتا ہے! اس سوال کا جواب مندرجہ صدر آیت کے باقی ماندہ حصہ میں یہ کہہ کر دیا گیا ہے کہ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ (۳/۷۹) پوری آیت کا ترجمہ یہ ہوگا کہ

> کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں ـــــ خواہ اُسے خدا کتاب (ضابطۂ قوانین) حکومت اور نبوت بھی کیوں نہ دیدے ـــــ کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کو چھوڑ کر میری محکومی اختیار کرو۔ وہ یہی کہے گا کہ تم اس کتاب کی رو سے جسے تم پڑھتے ہو اور اپنے دلوں پر نقش کرتے ہو ربانی بن جاؤ۔

اس سے معلوم ہوا کہ "خدا کی حکومت" اس کتاب کی رُو سے قائم ہوتی ہے جسے وہ بطور اپنے ضابطۂ حکومت کے لوگوں کی طرف نازل کرتا ہے۔ اسی حقیقت کو اس نے دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴)

جو شخص اس (کتاب) کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتا (معاملات کے فیصلے نہیں کرتا) جسے اللہ نے نازل کیا ہے تو یہی لوگ کافر ہیں۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کی رُو سے۔

(۱) آزادی سے مفہوم یہ ہے کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان سے اپنی اطاعت نہ کرائے۔ اطاعت صرف قانون کی کی جائے۔ اور

(۲) وہ قانون بھی کسی ایک فرد یا افراد کی جماعت کا بنایا ہوا نہ ہو بلکہ خدا کا عطا کردہ ہو۔

اس اصول کو ہم مختصر الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ قرآن کی رُو سے

حکومت کا حق صرف خدا کو حاصل ہے جو اس کی کتاب کی رُو سے عملاً قائم ہوتی ہے۔

"لا الٰہ۔ الا اللہ" اسی انقلابی دعوت کا منشور ہے۔ "لا الٰہ" کے معنی یہ ہیں کہ دنیا میں کوئی حاکم۔ کوئی صاحبِ اقتدار نہیں۔ اور "الا اللہ" کے معنی ہیں ـــــ سوائے اللہ کے ـــــ اور محمدؐ رسول اللہ کے معنی یہ ہیں کہ محمدؐ خدا کے وہ پیغامبر ہیں جو خدا کی اس کتاب کو لائے جس کی رُو سے اس کی حکومت قائم ہوگی۔ وَلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا (۱۸/۲۶)۔ وہ (خدا) اپنی حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ لہٰذا توحید کے معنی ہیں، ان احکام و قوانین کی اطاعت جو اللہ نے اپنی کتاب میں دیئے ہیں۔

پروفیسر کوبن نے کہا تھا کہ صحیح بات وہی ہو سکتی ہے جو درحقیقت صحیح ہو۔ نہ کہ وہ جسے بہت سے لوگ صحیح کہہ دیں۔ سوال یہ ہے کہ کسی بات کے "درحقیقت صحیح" ہونے کا معیار کیا ہے؟ قرآن کی رُو سے وہ معیار یہ ہے کہ جو بات کتاب خداوندی کے مطابق ہو وہ صحیح ہے جو اس کے خلاف ہو وہ غلط ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جسے خود یورپ کے مفکرین تک بھی تسلیم کرنے پر مجبور ہیں۔ چنانچہ اطالوی مدبّر میزینی (MAZZINI) اس باب میں لکھتا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ عام رائے دہندگی کا اصول بہت اچھی چیز ہے۔ یہی وہ قانونی طریق کار ہے جس سے ایک قوم تباہی کے مسلسل خطرات سے محفوظ رہ کر اپنی حکومت آپ قائم کر سکتی ہے۔ لیکن ایسی قوم میں جس میں وحدتِ عقائد نہ ہو جمہوریت اس سے زیادہ اور کیا کر سکتی ہے کہ وہ اکثریت کے مفاد کی نمائندگی کرے۔ اور اقلیت کو مغلوب رکھے۔ ہم یا تو خدا کے بندے بن سکتے ہیں یا انسان کے۔ وہ ایک انسان ہو (ملوکیت) یا زیادہ (جمہوریت) بات ایک ہی ہے۔ اگر انسانوں کے اوپر کوئی اقتدارِ اعلیٰ

> نہ ہو تو پھر کون سی چیز ایسی رہ جاتی ہے جو ہمیں طاقتور افراد کے تغلب سے محفوظ رکھ سکے؟ اگر ہمارے پاس کوئی ایسا مقدس اور ناقابلِ تغیر قانون نہ ہو جو انسانوں کا وضع کردہ نہ ہو۔ تو ہمارے پاس وہ کونسی میزان رہ جاتی ہے جس سے ہم یہ پرکھ سکیں کہ فلاں کام یا فلاں فیصلہ عدل پر مبنی ہے یا نہیں۔ خدا کے علاوہ جو بھی حکومت قائم ہو اس میں نتائج کی حقیقت ایک ہی رہتی ہے۔ خواہ اس کا نام بوناپارٹ رکھ لیں یا انقلاب (REVOLUTION) اگر خدا درمیان میں نہ رہے تو اپنے زمانہ سلطنت میں ہر ایک مستبد بن جائے گا۔.... یاد رکھیئے کہ جب تک کوئی حکومت خدا کے قوانین کے مطابق نہیں چلتی اس کا کوئی حق مسلّم نہیں۔ حکومت تو منشائے خداوندی کی ترویج و تنفیذ کے لئے ہے اگر وہ اپنے فریضہ کی سرانجام دہی میں قاصر ہے تو تمہارا یہ حق ہی نہیں بلکہ فریضہ ہے کہ ایسی حکومت کو بدل ڈالو۔ (انسان نے کیا سوچا۔ صـ ۱۸۸)

قرآن کریم ایک ایسی حکومت قائم کراتا ہے جس میں اصولی قوانین وہ ہوں جو خدا نے وحی کے ذریعے عطا کئے ہیں۔ ان اصولی قوانین کی روشنی میں امت، باہمی مشاورت سے جزئی قوانین مرتب کرے اور انہیں معاشرہ میں نافذ کرے۔ اس مشاورت کے لئے مشینری کس قسم کی ہونی چاہیئے اس سے قرآن بحث نہیں کرتا۔ اپنے اپنے حالات کے تحت یہ مشینری خود وضع کی جاسکتی ہے۔ بنیادی سوال قرآن کے غیر متبدل اصول اور امت کا مشورہ ہے۔

خدا کی اس حکومت کو، جو اس کی کتاب (قرآن کریم) کی رو سے قائم ہوتی ہے، سب سے پہلے نبی اکرمؐ نے قائم کیا۔ جنھیں خدا کا حکم تھا کہ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ (۵/۴۸) "ان میں اس کتاب کے مطابق حکومت قائم کرو (فیصلے کرو) جسے خدا نے نازل کیا ہو" یاد رکھیئے۔ رسول کا فریضہ اتنا ہی نہیں ہوتا کہ وہ خدا کا پیغام انسانوں تک پہنچا دے۔ اس کا فریضہ یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ اس پیغام (کتاب اللہ) کے مطابق عملی معاشرہ (نظام یا حکومت) قائم کر کے دکھا دے کہ خدا کے قوانین ناممکن العمل نہیں۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں رسول اللہؐ کی سیرتِ طیبہ آنے والے انسانوں کے لئے اسوۂ حسنہ (اچھا نمونہ) بنتی ہے۔ عام طور پر کہا یہ جاتا ہے کہ قانون خواہ کیسا ہی اچھا کیوں نہ ہو، چونکہ اس پر عمل، انسانوں کے ذریعے ہی ہوتا ہے، اس لئے اس میں قانون نافذ کرنے والے انسانوں (EXECUTIVE AUTHORITY) کے ذاتی جذبۂ ملوکیت کی (کسی نہ کسی حد تک) آمیزش ضرور ہو جاتی ہے۔ قرآنی نظامِ حکومت کے ضمن میں اس کا امکان اور بھی زیادہ ہو جاتا ہے کیونکہ قرآن نے صرف اصولی قوانین دیئے ہیں۔ ان اصولوں کی روشنی میں، جزئی قوانین، امت کے باہمی مشورہ سے، مرتب کئے جائیں گے۔ لہٰذا اسلامی حکومت صرف اجرائیہ (EXECUTIVE) ہی نہیں ہوتی بلکہ جزئی قوانین کی حد تک اسے تقنین (LEGISLATURE) کے اختیارات بھی ہوتے ہیں۔ نبی اکرمؐ نے ان تمام فرائض کو نہایت حسن و خوبی سے

سرانجام دیا اور اپنے عمل سے دُنیا کو بتا دیا کہ قانون نافذ کرنے والا کس طرح اپنے ذاتی جذبات اور امیال و عواطف کو الگ رکھ کر قانون، اور خالص قانون کی اطاعت کرا سکتا ہے۔

آپ یہ دیکھئے کہ اُس مملکت میں نبی اکرمؐ کا مقام کیا تھا۔ سب سے پہلے یہ کہ آپؐ خدا کے رسول تھے جن پر ایمان لائے بغیر کوئی شخص مومن نہیں کہلا سکتا تھا۔ دوسرے یہ کہ آپؐ اس مملکت کے صدر اعظم بھی تھے۔ اور حضورؐ کے فیصلوں کے متعلق خود خدا کا یہ حکم تھا کہ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا۔ (۴/۶۵) "تیرا رب اس حقیقت پر شاہد ہے کہ یہ لوگ قطعاً مومن نہیں ہو سکتے جب تک یہ اپنے تمام اختلافی مسائل میں تجھے حکم نہ مانیں اور پھر جو فیصلہ تو کر دے۔ اس کے متعلق اپنے دل میں بھی کسی قسم کی کبیدگی محسوس نہ کریں بلکہ اس کی پوری پوری فرمانبرداری کریں"۔ یعنی امت کے تمام متنازعہ فیہ امور میں حضورؐ کا فیصلہ آخری اور قطعی تھا (جس کے خلاف کہیں اپیل نہیں ہو سکتی تھی) اور جماعت مومنین کے لئے ضروری تھا کہ وہ ان فیصلوں کو بطیب خاطر مانے اور ان کی پوری پوری پابندی کرے۔ البتہ کرنے والا اُس جماعت کا ممبر نہیں رہ سکتا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی حضورؐ کو یہ بھی حکم تھا کہ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (۳/۱۵۹) امور مملکت میں اپنی جماعت سے مشورہ کیا کرو۔ ظاہر ہے کہ مشورہ میں ہر ایک کو اظہارِ خیال کی آزادی تھی۔

اور تیسرے یہ کہ قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (۱۸/۱۱۰) "ان سے کہدے کہ میں تمہارے جیسا ایک انسان ہوں"۔

آپ ان تینوں حیثیتوں کو سامنے رکھئے۔ اور پھر غور کیجئے کہ جس ذات گرامیؐ میں یہ تینوں حیثیتیں یک جا جمع ہوں اس کے لئے زندگی کا ایک ایک قدم کتنی بڑی نزاکتیں اپنے اندر رکھتا ہوگا۔ ایک طرف رسول کی حیثیت ہے کہ جس میں، دوسرے تو ایک طرف، خود اپنی ذات کو بھی کسی قسم کے ردوبدل یا حک و اضافہ کا کوئی اختیار نہیں۔ حضورؐ نے وحی کی اطاعت کرنی ہے اور اس میں سب سے آگے آگے رہنا ہے۔ (وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ۔ ۶/۱۶۳ حضورؐ کا اعلان تھا)۔ اس کے بعد امیر مملکت کی حیثیت ہے کہ جس میں اپنے رفقاء سے مشورہ کرنا فرض ہے لیکن جب فیصلہ دیدیا جائے تو اس فیصلہ کی بطیب خاطر پابندی جماعت کے ہر ایک رکن پر لازم ہو جاتی ہے۔ اور تیسری حیثیت بشریت کی ہے جس میں حضورؐ اپنی ذات کے لئے نہ کسی قسم کے تفوق کا مطالبہ یا تمنا کرتے ہیں اور نہ ہی قانون کے نفاذ میں اپنے ذاتی جذبات کی ذرا سی آمیزش ہونے دیتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اس باب میں (بحکم باری تعالیٰ آپؐ) یہ اعلان بھی فرماتے ہیں کہ قُلْ إِنْ ضَلَلْتُ فَإِنَّمَا أَضِلُّ عَلَىٰ نَفْسِي ۖ وَإِنِ اهْتَدَيْتُ فَبِمَا يُوحِي إِلَيَّ رَبِّي ۚ إِنَّهُ سَمِيعٌ قَرِيبٌ (۳۴/۵۰) ان سے کہدو کہ اگر میں (کہیں) غلطی کر جاتا ہوں تو اس غلطی کا میں خود ذمہ دار ہوتا ہوں۔ اور اگر میں سیدھے راستے پر ہوں تو وہ اس وحی کی بنا پر ہے جسے میرا رب میری طرف بھیجتا ہے۔ وہ سننے والا ہے۔ قریب ہے۔

قوانین خداوندی کی اطاعت کراتے ہیں، حضورؐ نے ان تینوں حیثیتوں کا کس طرح خیال رکھا اور کس شدت سے

ان کی نگہبانی کی، کتب سیرت میں قدم قدم پر اس کی شہادات ملتی ہیں۔ لیکن ہم اس موقع پر صرف اس ایک واقعہ پر اکتفا کرتے ہیں جس کی اہمیت کے پیشِ نظر، قرآنِ کریم نے اسے اپنی آغوش میں محفوظ کرلیا ہے۔ وہ واقعہ حضرت زیدؓ سے متعلق ہے۔ (واضح رہے کہ قرآن میں صرف ایک ہی صحابیؓ کا نام لیا گیا ہے اور وہ حضرت زیدؓ ہیں جن کا واقعہ اس وقت درج قرطاس ہے) قرآن نے اس واقعہ کی ابتداء ان الفاظ سے کی ہے وَإِذْ تَقُولُ لِلَّذِي أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَأَنْعَمْتَ عَلَيْهِ (۳۳/۳۷) "جب تو اس سے کہہ رہا تھا جس پر اللہ نے انعام کیا اور تو نے انعام کیا" لہٰذا پہلی بات دیکھنے کی یہ ہے کہ وہ انعامات کیا تھے جن کا اس قدر خصوصیت سے ذکر کیا گیا ہے۔ (حضرت) زیدؓ حضرت خدیجہؓ کے غلام تھے۔ جب حضرت خدیجہؓ نے نبی اکرمؐ سے نکاح کیا تو انہوں نے حضرت زیدؓ کو حضورؐ کی خدمت میں دے دیا۔ اس طرح حضرت زیدؓ خود نبی اکرمؐ کے غلام بن گئے۔ لیکن آپؐ نے حضرت زیدؓ کو آزاد کردیا۔ یہ سب سے پہلا انعام تھا جو حضرت زیدؓ پر کیا گیا۔ یہ انعام ہی کچھ کم نہ تھا کہ حضورؐ نے انھیں اپنا منہ بولا بیٹا بنالیا ---- رسول اللہؐ کا منہ بولا بیٹا! ---- اس سے بڑھ کر شرف و مجد اور کیا ہو سکتا تھا۔ اس سے آگے بڑھے تو حضورؐ نے حضرت زیدؓ کی شادی، اپنی پھوپھی زاد بہن (حضرت زینبؓ) سے کردی ---- اللہ اکبر! قریش کے گھرانے کی ممتاز ترین خاتون کی شادی ایک (آزاد شدہ) غلام کے ساتھ!

ظاہر ہے کہ اس نکاح کی خبر نے پورے عرب میں تہلکہ مچادیا ہوگا۔ ان کی تاریخ میں شاید یہ پہلا واقعہ ہو کہ اتنے بلند حسب ونسب کی خاتون کی شادی ایک (آزاد کردہ) غلام کے ساتھ ہوئی ہو۔

لیکن اتفاق دیکھئے کہ یہ شادی نبھ نہ سکی اور حضرت زیدؓ نے اپنی بیوی کو طلاق دینے کا ارادہ کرلیا۔ اس پر رسول اللہؐ حضرت زیدؓ کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ (۳۳/۳۷) ---- زید اپنی بیوی کو طلاق مت دو۔ اسے اپنے پاس رکھو ----

ذرا غور کیجئے کہ کہنے والا کون ہے؟ وہ بات کیا کہہ رہا ہے اور کس سے کہہ رہا ہے؟

کہنے والے خود نبی اکرمؐ ہیں جن کی رسالت پر ایمان لاکر (حضرت) زیدؓ مومن کہلاتے ہیں۔ پھر حضورؐ، حضرت زیدؓ کے اتنے بڑے محسن ہیں کہ آپ نے انھیں غلامی سے آزادی عطا فرمائی تھی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ آپؐ حضرت زیدؓ کے لئے بمنزلہ باپ کے ہیں ---- نیز آپؐ مملکتِ اسلامیہ کے صدر اعظم بھی ہیں۔ جس خاتون کے متعلق کہہ رہے ہیں (کہ اسے طلاق مت دو) وہ آپؐ کی پھوپھی زاد بہن ہیں۔ گویا ایک بھائی اپنی بہن کے متعلق کہہ رہا ہے۔ نیز جن حالات میں آپؐ نے یہ رشتہ کرایا تھا، اس کی نزاکت کا بھی تقاضا تھا کہ یہ عقد کامیاب رہتا۔ حضرت زیدؓ سے یہ کہنے میں کہ اپنی بیوی کو طلاق مت دو، یہ جذبہ بھی پنہاں تھا۔

آپ ان تمام حالات کو پیشِ نظر رکھئے اور پھر سوچئے کہ حضورؐ کے اس ارشاد کا جواب حضرت زیدؓ کی طرف سے کیا ہونا چاہیئے تھا؟ لیکن آپ یہ سنکر حیران ہوں گے کہ حضرت زیدؓ نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔ اور اس پر حضورؐ کی

پیشانی پر بل تک نہ آیا۔ حضرت زیدؓ کے ساتھ جو تعلقات پہلے تھے، وہی اس کے بعد بھی قائم رہے۔ حضرت زیدؓ کے اس فیصلہ کو نہ معصیتِ رسول قرار دیا گیا نہ نافرمانی امیر مملکت۔ نہ اسے "احسان فراموشی" سے تعبیر کیا گیا۔ نہ بزرگوں کی عزت کے منافی۔ حضورؐ کا یہ ارشاد کہ "زید اپنی بیوی کو طلاق مت دو" آپؐ کا ذاتی مشورہ تھا جسے ماننے یا نہ ماننے کا حضرت زیدؓ کو "قانونی حق" حاصل تھا۔ حضرت زیدؓ نے قانون کے مطابق فیصلہ کیا اور "ذاتی مشورہ دینے والے" نے حضرت زیدؓ کے اس فیصلہ کا پورا پورا احترام کیا۔

اسے کہتے ہیں آزادی۔ اور اسے کہتے ہیں ہیئتِ حاکمیہ کا قانون کے نفاذ میں اپنے ذاتی امیال و عواطف کو قطعاً پاس نہ آنے دینا۔ قرآن نوعِ انسانی کو اس قسم کی آزادی دینے کے لئے آیا تھا اور نبی اکرمؐ نے اپنے حسنِ عمل سے یہ دکھا دیا کہ اس قسم کی آزادی کس طرح دی جاتی ہے۔ وہ تھی تعلیم اور یہ تھا اُس تعلیم کا عملی نمونہ۔ جب تک دنیا اُس تعلیم اور اس عمل (یعنی قرآن اور سیرت نبی اکرمؐ) کو اپنے سامنے نہیں رکھتی۔ انسان صحیح آزادی کے لُطف سے لذت آشنا نہیں ہو سکتا۔

اس مقام پر عام طور پر کہدیا جاتا ہے کہ صاحب! حضور نبی اکرمؐ تو خدا کے رسول تھے اس لئے آپ قرآن کی تعلیم پر اس انداز سے کاربند ہو سکتے تھے۔ ہم لوگ بھلا حضورؐ کا مقابلہ کر سکتے ہیں؟ یہ (بظاہر معصوم سی خوش آئند) معذرت، بہت بڑی بنیادی غلطی کی حامل اور بڑے دور رس مضرت رساں نتائج کی موجب ہے۔ اگر قرآن کی تعلیم ایسی ہے جس پر عام انسان عمل نہیں کر سکتے تو قرآن تمام نوعِ انسانی کے لئے ضابطۂ ہدایت نہیں بن سکتا۔ اور اگر حضورؐ کا عمل ایسا ہے جس کی تقلید کسی کے لئے ممکن نہیں تو آپؐ کی حیاتِ طیبہ ہمارے لئے اسوہ (نمونہ) نہیں بن سکتی۔ اس قسم کی معذرتیں، درحقیقت ہماری پستی کردار اور کوتاہی عمل کے لئے (دانستہ یا نادانستہ) وجہ جواز مہیا کرنے کی خود فریبانہ کوششیں ہیں۔ قرآن کی تعلیم، ہر زمانے میں معاشرہ کے لئے قابلِ عمل ہے اور نبی اکرمؐ کی عملی مثال ہر انسان کے لئے بہترین نمونہ۔

سوال یہ ہے کہ جن حالات سے ہم دوچار ہیں، ان میں اس مقام تک کس طرح پہنچا جائے۔ جس میں قرآنی تعلیم بہ اندازِ نبی اکرمؐ عمل پیرا ہوا جائے۔ اس کا جواب آسان ہے۔ کرنے کا کام یہ ہے کہ ہم اپنے آئین کی بنیاد قرآنی اصولوں پر رکھیں۔ یہ ہمارا النصب العین ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی، ہم اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت اس نہج پر کریں کہ ان کے قلب و دماغ، قرآنی تعلیم اور حضورؐ کی سیرتِ مقدسہ کے قالب میں ڈھل جائیں۔ جب ہماری یہ نسل پروان چڑھے گی تو معاشرہ اُسی دورِ ہمایوں کا آئینہ دار ہو جائے گا جس کے متعلق ہم آج (نہایت سہل انگاری سے) کہہ دیتے ہیں کہ اُس دور کا دوبارہ احیا نا ممکن ہے۔ اس عبوری دَور میں (یعنی جب تک ہماری صحیح تربیت یافتہ نسل پروان نہیں چڑھتی) ہمیں حسن تدبیر اور قوت کے عادلانہ استعمال سے معاشرہ کو قرآنی آئین و ضوابط کے ساحل میں محصور رکھنا ہوگا۔ قرنِ اول اور ہمارے

موجودہ حالات میں فرق یہ ہے کہ اس دور میں افراد کی تعلیم و تربیت پہلے ہو چکی تھی اور مملکت بعد میں وجود میں آئی تھی۔ لیکن ہمیں افراد کی تعلیم و تربیت سے پہلے مملکت مل گئی ہے۔ لہذا ہمیں بیک وقت دو کام کرنے ہیں۔ ایک مملکت کا تحفظ اور دوسرے افراد کی تعلیم و تربیت۔ اس کے لئے یہی طریق کار ممکن ہے کہ ہم اپنی آنے والی نسلوں کی تعلیم و تربیت پر پوری توجہ مرکوز کر دیں۔ اور اس دوران میں، مملکت کے تحفظ کا ہر ممکن انتظام کریں۔ ہمارے مجوزہ آئین میں، ہماری منزلِ مقصود (یعنی قرآنی معاشرہ اپنی مکمل شکل میں) اور عبوری دَور، دونوں کے لئے راہ نمائی ہونی چاہیئے۔ اس سے ہم فرشِ آدمیت پر پاؤں ٹیکا کر، مقامِ مومن کی بلندی تک پہنچ سکیں گے۔ آج جشنِ عیدِ میلاد النبیؐ کا ہمارے لئے یہی پیغام ہے۔

جو کچھ سابقہ صفحات میں کہا گیا ہے اسے ایک مرتبہ پھر دہرا لیجئے۔ انسان زیادہ سے زیادہ آزادی (FREEDOM FOR CHOICE) چاہتا ہے اور اسے زیادہ سے زیادہ آزادی ملنی چاہیئے۔ لیکن تمدنی زندگی میں ایک فرد کی آزادی کا اثر دیگر افراد پر بھی پڑتا ہے اسلئے اس کی آزادی کے لئے کچھ حدود مقرر کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ قانون کا مقصد ان حدود کا تعین ہے۔ قرآن نے قصۂ آدم کے تمثیلی انداز میں اسی حقیقت کو اجاگر کیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ ایک زندگی ملائکہ کی ہے جنہیں کسی قسم کی آزادی حاصل نہیں۔ یَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ (16/50) ان کا شعار ہے۔ یعنی انہیں جو کچھ کہا جاتا ہے وہ کر دیتے ہیں ان کے بالکل برعکس دوسرا نہج زندگی ابلیس کا ہے جو اپنے اوپر کسی پابندی کو بھی گوارہ نہیں کرتا اَبٰی وَاسْتَکْبَرَ (2/34) یعنی سرکشی اس کا شعارِ زندگی ہے انسان ان دونوں کے بین بین ہے ایکطرف اسکی آزادیوں کا یہ عالم ہے کہ اسے اجازت ہے کہ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ (41/40) "جو تمہارا جی چاہے کرو"۔ لیکن اسکے ساتھ ہی اسے یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ تِلْکَ حُدُوْدُ اللّٰہِ فَلَا تَقْرَبُوْھَا (2/187)۔ "یہ اللہ کی مقرر کردہ حدود ہیں ان کے قریب نہ جانا" ابلیسی زندگی کا مظہر مغرب کا (SECULAR) نظام ہے جس میں کسی پابندی کو غیر متبدل نہیں سمجھا جاتا۔ ملائکہ کی یکسر مجبور زندگی کا مظہر انسانوں کا خود ساختہ مذہب ہے جس میں انسان کی ہر نقل و حرکت پر پابندی عائد ہوتی ہے۔ قرآنی نہج زندگی ناقابلِ تغیر حدود کے اندر ہر قسم کی آزادی کا نام ہے۔ یہ حدود خدا کی مقرر کردہ ہیں اور قرآن کی دفتین میں محفوظ ہیں۔ حضورؐ نے اسی کے مطابق معاشرہ قائم کیا تھا۔

مغرب زدہ ذہنیتیں سیکولر انداز کی حکومت چاہتی ہیں۔ ہمارا قدامت پرست طبقہ یکسر پابندیوں کی حکومت چاہتا ہے۔ طلوعِ اسلام قرآنی نظام کا داعی ہے اسی لئے مغرب زدہ ذہنیتیں بھی اس کے خلاف ہیں اور قدامت پرست طبقہ بھی اس کا دشمن لیکن طلوعِ اسلام کا ایمان ہے کہ آخر الامر کامیابی قرآنی نظام ہی کو ہو گی کیونکہ وہی نظام انسانی شرف و تکریم کا ضامن ہو سکتا ہے۔ اسی کا نام سنتِ رسول اللہؐ کا اتباع ہے۔ یعنی قرآنی معاشرہ کا قیام خدا کا حکم اور رسول اللہ کی سنت ہے۔ یہی طلوعِ اسلام کی دعوت ہے۔

شکریہ

میری ذاتی اپیل پر جو اگست ۱۹۵۹ء کے طلوع اسلام میں شائع ہوئی تھی، احباب نے جس خلوص اور محبت سے لبیک کہا ہے اس کا میرے دل پر گہرا اثر ہے۔ میں نے ان احباب کے نام انفرادی خطوط بھی لکھے ہیں لیکن چونکہ اپیل طلوع اسلام میں شائع ہوئی تھی اسلئے میں نے ضروری سمجھا ہے کہ احباب کا شکریہ طلوع اسلام کی وساطت سے بھی ادا کیا جائے۔ خدا کرے کہ احباب کا یہ مخلصانہ تعاون ہمارے راستے کو آسان کر دے اور ہمیں منزلِ مقصود تک پہنچانے میں بہترین رفیق ثابت ہو۔

(۲) اس پروگرام میں شرکت کا اظہار کرنے والے احباب میں اکثریت ان کی تھی جنھوں نے لکھا تھا کہ اگرچہ انکی مالی حالت اچھی نہیں لیکن اسکے باوجود وہ اس میں شرکت سے محروم رہنا نہیں چاہتے۔ ان احباب کے جذبۂ صادق کی میرے دل میں خاص طور پر قدر ہے لیکن چونکہ میں دوست اس اپیل کو صرف ان احباب تک محدود رکھنا چاہتا ہوں جو اس میں بسہولت حصہ لے سکیں، اسلئے میں نے مذکورہ بالا احباب سے معذرت چاہی ہے کہ وہ ابھی اس میں حصہ نہ لیں۔ انکی طرف سے امداد کا وقت شاید بعد میں آجائے۔ ان احباب کو بھی میں نے انفرادی خطوط لکھ دیئے ہیں میں طلوع اسلام کی وساطت سے انھیں یقین دلاتا ہوں کہ ان کے پُرخلوص جذبۂ تعاون کا میرے دل میں بڑا احترام ہے۔

بعض بزموں نے بھی اسی قسم کی پیشکش کی ہے لیکن میں نے ان سے بھی معذرت چاہی ہے۔ بزمیں اس سلسلہ میں جو کچھ کر رہی ہیں انھیں اُسی میں مزید کوشش کرنی چاہیئے۔

(۳) احباب کے مالی تعاون سے کہیں زیادہ میرے لئے وجۂ طمانیت باعثِ تقویت وہ خطوط ہیں جو مجھے اس سلسلہ میں موصول ہوئے۔ مجھے یہ دیکھ کر انتہائی خوشی ہوئی کہ حلقہ طلوع اسلام میں اس کثرت سے ایسے احباب موجود ہیں جو قرآنی فکر کی غایت کو نہایت عمدگی سے سمجھتے ہیں اور قرآنی آئین کی اہمیت کا کماحقہٗ احساس رکھتے ہیں۔ یہ امر بھی وجۂ مسرت ہے کہ ان احباب میں بیشتر ایسے ہیں جنھیں میں ذاتی طور پر نہیں جانتا اور وہ مجھے کبھی ملے بھی نہیں۔ ان کا رشتہ صرف قرآنی فکر کی ہم آہنگی ہے۔ اس رشتے سے محکم تر رشتہ اور کون سا ہو سکتا ہے؟

(۴) میں نے ان احباب سے کہا ہے کہ وہ اپنے تعاون کو مالی امداد تک ہی محدود نہ رکھیں بلکہ اس سلسلہ میں ادارہ کی طرف سے جو لٹریچر شائع ہو اسے ذاتی طور پر اپنے احباب تک پہنچائیں تاکہ اس طرح قرآنی فکر ان مقامات تک پہنچ جائے جہاں تک اس کا پہنچنا ضروری ہے۔

میری دیگر احباب سے بھی درخواست ہے کہ وہ اپنے طور پر متعلقہ پمفلٹ ادارہ سے منگائیں اور انکی زیادہ سے زیادہ اشاعت کریں مثلاً اسی ماہ "اسلامک آئیڈیالوجی" کے عنوان سے (اردو اور انگریزی میں) جو پمفلٹ شائع ہوئے ہیں۔ ان کی عام اشاعت کی بڑی ضرورت ہے بالخصوص انگریزی خواں طبقہ میں (انگریزی) پمفلٹ کی۔

(۵) میں اپنے جملہ احباب کا بار دیگر شکریہ ادا کرتا ہوں۔ والسلام

پرویز

گہر ہائے عقیدت

بحضور رسالتمآب۔ ختمی مرتبت۔ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم)

یوں تو طلوعِ اسلام کی ہر اشاعت، قرآن اور صاحبِ قرآن (علیہ التحیہ والسلام) کے تذکارِ جلیلہ کی مظہر ہوتی ہے لیکن ربیع الاول کا مہینہ نوعِ انسان کے لئے جس خیر و برکت اور یمن و سعادت کا ضامن بنا، اس کے احترام کے پیشِ نظر، اس ماہ سے متعلق اشاعت میں، حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کے سلسلہ میں خصوصی طور پر کچھ نہ کچھ شائع کیا جاتا ہے۔ حضورؐ کی سیرت پر، جو کچھ "معراج انسانیت" میں لکھا گیا ہے، اس سے ہٹ کر اور کیا لکھا جا سکتا ہے۔ اس لئے ہم آئندہ اوراق میں اسی مایۂ ناز تصنیف کے چند اقتباسات پیشِ خدمت کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔

۱۔ مقامِ نبوّت

نبوت کا مقام تو اس قدر عظیم المرتبت ہے کہ اس کے تصور سے روح میں بالیدگی، نگاہوں میں بصیرت، ذہن میں جلا، قلب میں روشنی، خون میں حرارت، بازوؤں میں قوت، ماحول میں درخشندگی، فضا میں تابندگی اور کائنات کے ذرہ ذرہ میں زندگی کے آثار نمودار ہو جاتے ہیں۔ نبی کا پیغامِ انقلاب آفریں، دین و دنیا کی سرفرازیوں اور سربلندیوں کا امین ہوتا ہے۔ وہ مُردوں کی بستی میں صورِ اسرافیل پھونک دیتا ہے۔ اس سے قوم کے عروقِ مفلوج میں پھر سے خونِ حیات رقص کرنے لگ جاتا ہے۔ وہ اپنی ملت کو زمین کی پستیوں سے اٹھا کر آسمان کی بلندیوں تک پہنچا دیتا ہے اور ان کے ایک ہاتھ میں زمین کی خلافت اور دوسرے میں آسمان

کی بادشاہت دیدیتا ہے۔ وہ اپنی ہوش ربا تعلیم اور محیر العقول عمل سے باطل کے تمام نظامہائے کہنہ کی بنیادیں اکھیڑ کر آئین کائنات کو ضابطۂ خداوندی پر متشکل کر دیتا ہے۔ اس سے زندگی ایک نئی کروٹ لیتی ہے۔ آرزوئیں آنکھیں ملتے ہوئے اٹھتی ہیں۔ ولولے جاگ پڑتے ہیں۔ ایمان کی حرارتیں دلوں میں سوز اور جگر میں گداز پیدا کرتی ہیں۔ روح کی مسرتوں کے چشمے ابلتے ہیں۔ قلب و جگر کی کی نورانیت کی سوتیں پھوٹتی ہیں۔ تازہ امیدوں کی کلیاں مہکتی ہیں۔ زندہ مقاصد کے غنچے چٹکتے ہیں اور اس خوش بخت قوم کا صحن چمن، دامانِ صد باغبان و کفِ گلفروش کا فردوسی منظر پیش کرتا ہے۔ حکومتِ الٰہیہ کا قیام اس کا نصب العین اور قوانینِ خداوندی کا نفاذ اس کا منتہا ہوتا ہے۔ جب اس کے ہاتھوں خدا کی بادشاہت کا تختِ جلال بچھتا ہے تو باطل کی ہر طاغوتی طاقت پہاڑوں کے غاروں میں سر چھپاتی پھرتی ہے۔ جور و استبداد کے قصر فلک بوس کے کنگورے سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔ طغیان و سرکشی کے آتشکدے ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں۔ وہ اپنے ساتھیوں کی قدوسی جماعت کے ساتھ اعلائے کلمۃ الحق کے لئے باہر نکلتا ہے تو فتح و ظفر اس کی رکاب چومتی ہے۔ شوکت و حشمت اس کے جلو میں چلتی ہے۔ سرکش اور خود پرست قوتیں اس کے خدائے واحد القہار کا کلمہ پڑھتی ہیں اور خدا اور اس کے فرشتے، ان انقلاب آفریں ملکوتی کارناموں پر تحسین و تبریک کے پھولوں کی بارش کرتے ہیں۔ ان اللہ وملائکتہٗ یصلون علی النبی۔

۲۔ قرآن و سیرت

آسمانی سلسلۂ رشد و ہدایت سے مقصود و مطلوب کیا ہے؟ اس کی تشریح و تبیین میں کتابوں پر کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔ لیکن اگر اسے مجملاً چند الفاظ میں سمجھنا ہو تو اس سے مفہوم یہ ہے کہ انسان اپنی تمدنی اور معاشی زندگی یعنی ہیئت اجتماعیہ کو کس طرح ان مستقل اقدار سے ہم آہنگ رکھ سکتا ہے جو ایک ہمہ گیر آفاقی ضابطہ قوانین کی حیثیت سے کارگہ ہستی کو اس نظم و ضبط توازن و اعتدال اور حسن و رعنائی سے نہ صرف سرگرم عمل رکھ رہی ہیں بلکہ اس کے تعمیری پہلوؤں کو بروئے کار لا کر اسے تخلیقی ارتقاء کے مراحل طے کراتے ہوئے رواں دواں جانب منزل لئے جا رہی ہیں۔ قرآن میں اقوام و ملل سالفہ کے احوال و کوائف اور حضرات انبیائے کرامؑ کے تذکار جلیلہ سے بھی یہی بتانا مقصود ہے کہ جب انسان نے اپنے تمدنی و معاشی نظام (یعنی حیات اجتماعیہ) کو آفاقی قوانین سے الگ کر لیا تو اس کا نتیجہ زندگی کی ان ناہمواریوں کی شکل میں سامنے آگیا جسے وہ فساد کی جامع اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے اور جس سے کاروانِ انسانیت، شرف و مزیت کی طرف جانے کی بجائے سبعیت و بہیمیت کی پستیوں کے جہنم میں جا گرا۔ اور اس کے برعکس جب انھوں نے اپنی زمینی زندگی (حیاتِ ارضی۔ معاشی نظام) اور آسمانی اقدار میں توافق اور ہم آہنگی پیدا کر لی (جسے تقویٰ کہا جاتا ہے) تو کس طرح زمین اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھی اور عالم انفس و آفاق میں کس طرح شگفتگی و شادابی کی جنتیں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ بعثت نبی اکرمؐ کے وقت یہ فساد اپنی وسعتوں

اور گہرائیوں کے اعتبار سے پوری شدت اختیار کر چکا تھا۔ لیکن نوعِ انسانی کے اس محسنِ اعظم اور آسمانی انقلاب کے اس داعیٔ اکبر کی تیئس ۲۳ سالہ سعی و عمل سے انسانی نظامِ حیات کے یہ تمام ناہموار گوشے یکسر ہمواریوں اور استواریوں میں بدل گئے۔ اور انسانیت نے اس فردوسِ گم گشتہ کو اپنی آنکھوں کے سامنے تبسّم ریز و کوثر فشاں دیکھ لیا جس کی تلاش میں وہ قرن ہا قرن سے حیران و سرگرداں پھر رہی تھی۔ لہٰذا سیرتِ محمدیہ درحقیقت تعارف و تاریخ ہے۔ اس انقلاب کی جس سے انسانیت پستیوں اور ناہمواریوں کے اس ذلّت آمیز و کرب انگیز جہنم سے نکل کر جس میں اُسے ملوکیت کی مستبدانہ دراز دستیوں، پیشوائیت کی ابلیسانہ دسیسہ کاریوں اور مفاد پرست گروہوں کی سفاکانہ خون آشامیوں نے دھکیل رکھا تھا۔ بلندیوں اور ہمواریوں کی اُس روح پرور اور نشاط انگیز جنت میں جا پہنچی جس میں ہر متنفس کے مضمر جوہروں کی بالیدگی اور ثمر باری کے اسباب و مواقع بلا روک ٹوک موجود تھے کشجرۃ طیبۃ اصلھا ثابت وفرعھا فی السماء۔ اس شجرِ طیب کی طرح جس کی جڑیں زمین (کے معاشی اور تمدنی نظام) میں محکم و استوار ہوں اور جس کی شاخیں آسمانی (اقدارِ مستقلہ کی) جنت در آغوش فضاؤں میں مسرتوں کے جھولے جھول رہی ہوں۔ ذالک ھو الفوز العظیم۔

قرآن نے اس انقلابِ عظیم کی تاریخ کو اپنی لوحِ محفوظ میں منقوش رکھا ہے۔ تاکہ آنے والی نسلیں جب کبھی اپنے نظامِ زندگی کو فطرت کے صحیح خطوط پر متشکل کرنا چاہیں تو یہ تاریخی یادداشتیں (ذکر للعالمین) ان کے لئے چراغِ راہ بن سکیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ تیئس ۲۳ برس پر پھیلے ہوئے اس انقلابِ انسانیت کی تمام تفاصیل و جزئیات قرآن کے اندر نہیں مل سکیں گی۔ اس لئے کہ قرآن کا انداز یہی ہے کہ وہ اصولوں سے بیشتر اور جزئیات سے قلیل تر بحث کرتا ہے۔ اس لئے ان جزئیات کے لئے انسانوں کی جمع کردہ (ترتیب دادہ تاریخی یادداشتوں) سے بھی استفادہ ضروری ہو جاتا ہے۔ بظاہر یہ چیز بڑی آسان سی نظر آتی ہے۔ اس لئے کہ ہمارے ہاں کتبِ آثار و روایات میں سیرتِ طیبہ کے متعلق بڑا ذخیرہ موجود ہے لیکن ایک قرآنی سیرت نگار کے لئے یہی مرحلہ سب سے زیادہ دشوار طلب ہے اور یہ دشواری ہے قرآن اور تاریخ کی صحیح حیثیت کا تعین۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان فکر و نظر کی جس پریشانی و خلفشار اور خیالات و معتقدات کے تشتت و افتراق میں مبتلا چلا آ رہا ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ قرآن اور تاریخ کے صحیح تعلق کا عدمِ تعین ہے۔ یعنی اس نے قرآن اور تاریخ کا صحیح صحیح مقام متعین نہیں کیا جس کی وجہ سے زندگی کی حقیقت اور دین کا صحیح مقام اس کے سامنے واضح طور پر نہیں آتا۔ اگر ہم قرآن کو اس کا صحیح مقام دیدیں اور تاریخ کو اس کی حد سے آگے نہ بڑھنے دیں تو ہماری بیشتر مشکلات کا حل آج ہی مل جائے۔

قرآن ایک حقیقتِ ثابتہ اور ایک یقینی صحیفہ ہے جس کا ایک ایک لفظ وہی ہے جو نبی اکرمؐ کے حسن توسط سے امت کو ملا تھا۔ اس میں نہ کسی ریب و تشکیک کی گنجائش ہے نہ تغیر و تبدل کا امکان۔ لہٰذا جو کچھ قرآن میں ہے اسے بلا توقف و تامل حتمی اور یقینی قرار دیا جائے گا۔ لیکن تاریخ کی یہ حیثیت نہیں۔ تاریخ کی تدوین انسانوں کی انفرادی کوششوں

کا نتیجہ ہے اور ان کوششوں میں کتنی ہی احتیاط کیوں نہ برتی جائے۔ ان کا حاصل بہر کیف ظنی اور قیاسی رہیگا۔ لہذا تاریخ کو بہر حال قرآن کے تابع رکھنا چاہیئے۔ لیکن ہمارے ہاں بدقسمتی سے اس باب میں غلو برتا گیا۔ اور دین کی تاریخ کو نہ صرف قرآن کے ہم پایہ (مثلاً معاذ) سمجھ لیا گیا بلکہ اسے قرآن پر قاضی اور اس کا ناسخ تک قرار دیدیا گیا۔ یعنی ایک حتمی اور یقینی ذریعہ علم کو جس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالےٰ نے لے رکھا ہے، قیاسی اور ظنی ذریعہ علم کے تابع کر دیا گیا اور اس بحث کو صرف علمی دائرہ تک محدود نہیں بلکہ اسے جزوِ عقیدہ اور عین دین بنا دیا چنانچہ جب اس طرح تاریخ، دین کا جزو بن گئی تو تنقید کی حد سے بالا ہو گئی۔ اس غلط نگہی سے دین میں جس قدر تضاد اور ملت میں جس قدر انتشار پیدا ہوا وہ ہماری ہزار سالہ تاریخ اور مسلمانانِ عالم کی موجودہ تاسف انگیز حالت سے ظاہر ہے۔ اگر اس غلط بینی کا اثر صرف ہماری ذات تک ہی محدود رہتا تو بھی خیر، اسے طوعاً و کرہاً جھیل لیا جاتا۔ لیکن سب سے زیادہ جگر سوز اور دلدوز یہ جانکاہ حدیثِ الم ہے کہ ہم نے تاریخ کو دین کی حیثیت دے کر، خود سیرت حضور سرورِ کائناتؐ کو مخالفین کی ہرزہ سرائیوں کا ہدف بنا کر رکھ دیا۔ اس "ظلمِ عظیم" کا اندازہ وہی شخص لگا سکتا ہے جس نے غیر مسلم مصنفین کی مرتب کردہ کتبِ سیرت کا مطالعہ کیا ہے۔ یہ کتابیں اس قسم کی خرافات و مزخرفات سے بھری ہوئی ہیں جن کے تصور سے ہماری آنکھوں میں خون اُتر آتا ہے۔ لیکن ان کی بنیاد ان روایات پر ہوتی ہے جو ہمارے ہاں کی "صحیح ترین" کتبِ احادیث میں درج ہیں۔ ہم ان غیر مسلم مصنفین کو تو موردِ طعن و تشنیع اور گردن زدنی و کشتنی قرار دیتے ہیں لیکن ان روایات کے معصوم اور منزہ عن الخطاء ہونے کے عقیدہ کو بدستور اپنے سینوں میں محفوظ رکھتے چلے جاتے ہیں۔ یہ اس لئے کہ ہم نے تاریخ کی ان یادداشتوں کو دین کا جزو اور تنقید سے بالا قرار دے رکھا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ نبی اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ قرآن کے عین مطابق تھی۔ خود قرآن کریم میں حضورؐ سے بار بار ارشاد ہے کہ آپ وحی کا اتباع کریں اور اس کے سوا کسی اور راستہ پر نہ چلیں۔ خود حضورؐ نے بار بار اس کا اعلان فرمایا ہے کہ میں صرف وحی کا اتباع کرتا ہوں۔ اگر قرآن میں یہ کچھ بصراحت مذکور بھی نہ ہوتا تو بھی اس حقیقتِ باہرہ میں کسی شبہ کی گنجائش نہ تھی کہ حضورؐ کی سیرتِ مقدسہ اتباعِ قرآنی کی مشہود صورت تھی۔ اس لئے کہ اگر رسولؐ بھی اپنی وحی کا کامل اتباع نہیں کرے گا تو اور کون اس کے مطابق چلے گا؟ قرآن ہمارے پاس اپنی اصلی شکل میں بلفظہٖ موجود ہے۔ بالفاظ دیگر ہمارے پاس ایک ایسا یقینی اور حتمی ذریعۂ علم موجود ہے جس کی رو سے ہم بآسانی فیصلہ کر سکتے ہیں کہ تاریخ کا کون کونسا بیان درست ہے اور کونسا حصہ ناقابلِ اعتماد۔ یعنی اگر ہم دیکھیں کہ قرآن میں ایک حکم ہے اور کتبِ سیر و احادیث میں نبی اکرمؐ کا کوئی قول یا عمل اس کے خلاف مذکور ہے تو ہم بلا تردد اس نتیجہ پر پہنچ جائیں گے کہ تاریخ نے اس واقعہ کو صحیح شکل میں نہیں پہنچایا۔ اس لئے کہ جب کبھی ظن اور یقین میں تصادم دکھائی واقع ہو تو یقین کو بہر حال صحیح تسلیم کیا جائے گا ان الظن لا یغنی عن الحق شیئاً۔ ایک مثال سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی۔ قرآن میں ہے کہ کفار نبی اکرمؐ کے متعلق کہا کرتے تھے

کہ آپؐ (معاذ اللہ) رجل مسحور ہیں۔ یعنی آپؐ پر کسی نے جادو کر رکھا ہے جس کی وجہ سے آپ (پناہ بخدا) اس قسم کی بہکی بہکی باتیں کرتے رہتے ہیں۔

اِذْ یَقُوْلُ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ۝ (۱۷/۴۷)

جب یہ ظالم کہتے ہیں کہ تم ایک ایسے آدمی کی پیروی کرتے ہو جس پر کسی نے جادو کر رکھا ہے۔

یہ کفار کا طعن تھا جسے قرآن نے "ظالمین کا عمل" کہہ کر پکارا ہے اور حضورؐ کے دامن شرف و مجد کو اس الزام سے پاک ٹھہرایا ہے۔ لیکن بخاری شریف میں حضرت عائشہؓ کی زبانی یہ روایت مذکور ہے کہ حضورؐ پر کسی نے جادو کر دیا تھا جس کی وجہ سے آپؐ کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ آپ سمجھ لیتے تھے کہ میں فلاں کام کر چکا ہوں حالانکہ آپ نے وہ کام نہیں کیا ہوتا تھا (بخاری جلد دوم ص۱۳۷ مطبوعہ مصر) اب ظاہر ہے کہ قرآن کی مذکورہ صدر تصریح کے بعد اس روایت کا غلط ہونا کسی دلیل کا محتاج نہیں رہ سکتا۔ لیکن چونکہ بخاری شریف دین کا جزو قرار پا چکی ہے اس لئے اس روایت کو غلط سمجھنے والے کو "منکرِ حدیث" (لہٰذا دائرۂ اسلام سے خارج) قرار دیدیا جاتا ہے۔ اس سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ تاریخ کو یقینیات کا درجہ دے کر اور دین کا جزو ٹھہرا کر ہم نے کس قدر مشکلات پیدا کر رکھی ہیں اور اس سے یہ بات بھی سمجھ میں آگئی ہوگی کہ ایک قرآنی سیرت نگار کے لئے تاریخ کے ان ذخائر سے صحیح معلومات کا الگ کرنا کس قدر دشوار گذار مرحلہ ہے۔ میں چونکہ تاریخی نظائر و شواہد کی صحت و سقم کے لئے قرآن کو محور و معیار قرار دیتا ہوں۔ اس لئے معارف القرآن کی پیش نظر جلدیں، جو قرآن کی رو سے مرتب کردہ سیرتِ طیبہ پر مشتمل ہے، یہی محکم اصول سامنے رکھا گیا ہے کہ تاریخ کی انہی جزئیات کو قابلِ قبول سمجھا جائے جو قرآنی تعلیم کے مطابق ہوں۔

اس مرحلہ سے آگے ایک اور دشوار گذار گھاٹی بھی قرآنی سیرت نگار کے راستہ میں حائل ہوتی ہیں۔ ہماری کتب سیر و آثار میں مخالفین کی تدلیسات و تلبیسات کے علاوہ (جس کی ایک مثال اوپر آچکی ہے) عقیدت مندوں کے شدید غلو نے بھی کچھ کم مفتریات کا اضافہ نہیں کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح لوگوں نے خدا کو اپنے اپنے ذہن کے مطابق تراش رکھا ہے اسی طرح رسول کو بھی اپنے اپنے تصورات کے قالب میں ڈھال رکھا ہے جو تصور کسی کو محبوب تھا اس نے ویسا ہی رسول بنا کر پیش کر دیا۔ اس لئے رسول اکرمؐ کی سیرتِ عظمیٰ کے بیشتر گوشے عقیدت مندوں کے اپنے اپنے محبوب و مرغوب تصورات کے افسانوی پیکر بن گئے جنھیں انھوں نے عقیدت و ارادت کے نگاہ فریب پردوں میں لپیٹ رکھا ہے۔ ان عقیدتمندیوں نے نبی اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ کے صحیح خط و خال کو، محیر العقول مافوق البشریت اور تحیر انگیز خوارق کے دھندلکے میں اس طرح چھپا کر رکھا ہے کہ سیرتِ مقدسہ کا حقیقی پیکر کبھی نگاہوں کے سامنے آنے نہیں پاتا۔ قرآن نے اس ذاتِ گرامی کا جو مرقع پیش کیا ہے وہ ایک چلتے پھرتے انسان کا سیدھا سادا نقشہ ہے جو اپنے بیوی بچوں میں رہتا ہے۔ دوستوں سے ملتا جلتا ہے۔ کاروبار کرتا ہے جس میں اسے نفع بھی ہوتا ہے نقصان بھی۔ زندگی کے مراحل میں اسے رنج بھی

ہوتا ہے، راحت بھی۔ فتح بھی ہوتی ہے، شکست بھی، وہ اپنے مقصدِ پیشِ نظر کے لئے انسانوں کی طرح تدبیریں کرتا ہے اس میں اپنے رفقارِ کار سے مشورہ بھی لیتا ہے اور ان کی رائے پر عمل بھی کرتا ہے۔ ان تدابیر میں کبھی سقم بھی رہ جاتا ہے۔ جس کا علم ہو جانے پر اس کی تلافی کی جاتی ہے۔ وہ زندگی کے تضادات (CONFLIOTS) سے آنکھیں بند کر کے اپنے آپ کو فریب نہیں دیتا کہ وہ تضادات مٹ گئے ہیں۔ وہ ان کا خندہ پیشانی سے سامنا کرتا ہے اور اپنے قلب کے پورے سکون اور نگاہ کی کامل گہرائیوں سے ان میں عدیم النظیر اعتدال اور فقید المثال ہم آہنگی (HARMONY) پیدا کرتا ہے۔ جس سے حالات کی ناساعدت، حسین خوشگواریوں اور شگفتہ کامرانیوں میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ قرآن اس کی ان کامیابیوں کا راز اس کا اپنی دعوت کی صداقت پر ایمانِ محکم اور اپنے نصب العین کے حصول کے لئے سعیٔ پیہم میں قرار دیتا ہے۔ اس کے پاس سب سے بڑا معجزہ اس کی اپنی سیرت ہے جسے وہ مخالفین کے ہجوم اور دشمنوں کے اژدہام میں اپنی صداقت کے ثبوت میں بطور شہادت پیش کرتا ہے اور اس شہادت کے خلاف کہیں سے ایک انگلی بھی نہیں اٹھتی۔ یہ ہے وہ رسولؐ جسے قرآن پیش کرتا ہے اور پیش اس لئے کرتا ہے کہ آنے والے انسانوں کو بتا دیا جائے کہ جو ہستی انسانیت کے شرفِ اعلیٰ کے مقامِ بلند پر فائز ہوتی ہے اس کے خصائص و امتیازات ایسے ہوتے ہیں۔ تم اپنے آپ کو اس معیار پر پرکھ کر دیکھو کہ تم کہاں تک شرفِ انسانیت کے حامل ہو۔ تم جس قدر اس معیار پر پورے اترتے جاؤ گے، اسی قدر تمہاری انفرادی صلاحیت نکھرتی اور اجتماعی زندگی سنورتی جائے گی۔

حقیقت یہ ہے کہ رسول کو مافوق البشر قرار ہی اس وقت دیا جاتا ہے، جب قوم میں جذبۂ عمل اور جوشِ کردار باقی نہ رہے اُس وقت جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تمہارے رسولؐ نے یہ کچھ کر کے دکھا دیا تھا۔ لہٰذا تم بھی وہی کچھ کرو تو وہ اپنی کوتاہیٔ ذوقِ عمل کو اس فریبِ نفس میں چھپانے کی سعیٔ ناکام کرتے ہیں کہ صاحب! وہ تو خدا کے رسولؐ تھے ان کا مقام کچھ اور تھا۔ بھلا ہم عاجز بندوں کے لئے یہ کب ممکن ہے کہ ہم بھی وہی کچھ کر سکیں جو انہوں نے کیا۔ ہمیں ان سے کیا نسبت؟ فقدانِ عمل کا یہی وہ فریب تھا جس سے ہم نے خدا کو رفیقِ اعلیٰ کی بجائے پوجا پاٹ کا محل (OBJECT OF WORSHIP) قرار دے لیا۔ اور رسولؐ کو ایک انقلاب آفریں تصورِ حیات کا عملی معمار اور ملت کی ہیئتِ اجتماعیہ کا اولین مرکز سمجھنے کے بجائے، عجائب آفرینیوں کا مظہر اور چیستانِ خیال کا پیکر تصور کر لیا۔ ہم نے خدا کا مفہوم اتنا ہی سمجھ رکھا ہے کہ اس کے نام کی قسم کھائی جاتی ہے اور رسول سے اتنا ہی واسطہ کہ حضورؐ کے زلف و خط و خال کی تعریف میں قوالوں سے نعتیں سنی جاتی ہیں۔ ہماری زندگی کے عملی مسائل کا نہ خدا کے قانون سے کچھ تعلق ہے نہ اس کے رسولؐ کے متشکل فرمودہ نظام سے کچھ واسطہ!

معراجِ انسانیت میں آپ کے سامنے حضورِ رسالتمآب کا وہی پیکرِ حسن و خوبی آئے گا جسے قرآن نے ایک جیتے جاگتے چلتے پھرتے، ایمان و عمل کے بلند ترین مقام پر فائز انسان کی سیرت کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور جو ہر اس قوم کے لئے، جو دنیا میں اس قسم کا خوشگوار انقلاب پیدا کرنا چاہے جسے نبی اکرمؐ نے متشکل کر کے دکھا دیا تھا بہترین نصب العین بن سکتا ہے۔ اس

سیرتِ طیبہ اور حیاتِ نیرہ میں کوئی پُرپیچ و خم راہ نہیں۔ کوئی راز مستور نہیں۔ کوئی بتر پس پردہ نہیں۔ یہ ایک جگمگاتے ہوئے چراغ کی روشنی (سراجاً منیراً) ہے جو ایک طرف خود اس چراغ کے ہر پہلو کو، دیدۂ بینا کے سامنے بے نقاب کر دیتی ہے۔ اور دوسری طرف ہر شے کا اصلی مقام بھی متعین کر دیتی ہے۔ لیکن ہم نے جس طرح قرآن جیسے نیّرِ درخشندہ کو انسانی تصورات اور تخیلات کے بادلوں میں چھپا رکھا اور اس طرح اس کی روشنی اور حرارت سے نہ صرف اپنے آپ کو بلکہ ساری دنیا کو محروم کر رکھا ہے۔ اسی طرح ہم نے سیرتِ محمدیہ کے جگمگاتے چراغ کو بھی اپنے توہمات و معتقدات کے دبیز پردوں میں مستور کر رکھا ہے۔ آج ساری دنیا اس روشنی کے لئے مضطرب و بے قرار پھر رہی ہے (اور لوا لعجبی کہ ان حیران و سرگرداں پھرنے والوں میں یہ قوم بھی شامل ہے۔ جس نے اس نیّرِ درخشندہ و ضیائے تابندہ کو اپنے ہی دامن میں چھپا رکھا ہے) اور کوئی نہیں جو انہیں اس کا سراغ تک بھی دے۔ میرا ایمان ہے اور میں اس ایمان کے سہارے زندہ ہوں کہ اگر آج بھی قرآن سے ان تو بر تو پردوں کو الگ کر دیا جائے جو انسانی تصوّرات نے اس پر ڈال رکھے ہیں اور سیرتِ محمدیہ کو ان حشو و زوائد سے پاک کر دیا جائے جو ہماری ناعاقبت اندیشیوں اور غلط عقیدت مندیوں نے اس ذاتِ اقدس و اطہرؐ کی طرف منسوب کر رکھے ہیں، تو اندھیرے میں بھٹکنے والی انسانیت، اب بھی زندگی کی اس متوازن و ہموار راہ پر لگ سکتی ہے جو اسے شادابیوں اور کامرانیوں کی جنت کی طرف لے جانیوالی ہے۔ اس لئے کہ قرآن کا مقصود انسانیت سازی ہے۔ جس کا مشہود پیکر ذاتِ محمدیؐ ہے (لیکن وہی مشہود جسے قرآن نے پیش کیا ہے) جب تک دنیا اس مقام تک نہیں پہونچ جاتی، شرف و عزت کی فیروز مندیاں اس کے حصے میں نہیں آسکتیں۔ اور اس مقام تک پہنچنا اسی صورت میں ممکن ہے کہ قرآن اور سیرتِ صاحبِ قرآن (علیہ التحیۃ والسلام) دنیا کے سامنے اپنی اصلی شکل میں آجائے۔ معارف القرآن کا سلسلہ اسی مقصد کے حصول کی کوشش ناتمام ہے۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

جشن عید میلاد النبیؐ پر دو اہم پمفلٹ

رحمۃً للعالمینؐ

قیمت:۔ دو آنے

مقامِ محمدیؐ

قیمت:۔ چار آنے

ادارہ طلوع اسلام۔ ۲۵۔بی گلبرگ۔ لاہور

اس نقطۂ خیال سے دیکھئے تو پیغمبر اسلام دنیائے قدیم اور دنیائے جدید کے درمیان بطور حد فاصل کھڑے دکھائی دیں گے۔ اگر یہ دیکھا جائے کہ آپ کی وحی کا سرچشمہ کیاہے تو آپ دنیائے قدیم سے متعلق نظر آئیں گے۔ لیکن اگر اس حقیقت پر نظر کی جائے کہ آپ کی وحی کی روح کیا ہے تو آپ کی ذاتِ گرامی دنیائے جدید سے متعلق نظر آئے گی۔ آپ کی بدولت زندگی نے علم کے ان سرچشموں کا سراغ پالیا جن کی اُسے اپنی نئی شاہراہوں کے لئے ضرورت تھی۔ اسلام کا ظہور استقرائی علم کا ظہور ہے۔ اسلام میں نبوت اپنی تکمیل کو پہنچ گئی۔ اور اس تکمیل سے اس نے خود اپنی خاتمیت کی ضرورت کو بے نقاب دیکھ لیا۔ اس میں یہ لطیف نکتہ پنہاں ہے کہ زندگی کو ہمیشہ عہدِ طفولیت کی حالت میں نہیں رکھا جاسکتا۔ اسلام نے دینی پیشوائی اور وراثتی بادشاہت کا خاتمہ کردیا۔ قرآن کریم غور و فکر اور تجارب و مشاہدات پر بار بار زور دیتاہے اور تاریخ اور فطرت دونوں کو علم انسانی کے ذرائع ٹھہراتاہے۔ یہ سب اسی مقصد کے مختلف گوشے ہیں جو ختم نبوت کی تہہ میں پوشیدہ ہے۔

پھر عقیدۂ ختم نبوت کی ایک بڑی اہمیت یہ بھی ہے کہ اس سے لوگوں کے باطنی واردات (MYSTIC EXPERIENCES) کے متعلق ایک آزاد اور ناقدانہ طرزِ عمل قائم ہوتاہے۔ اس لئے کہ ختم نبوت کے معنی یہ ہیں کہ اب نوعِ انسانی کی تاریخ میں کوئی شخص اس امر کا مدعی نہیں ہوسکتا کہ وہ کسی مافوق الفطرت اختیار (SUPERNATURAL AUTHORITY) کی بنا پر دوسروں کو اپنی اطاعت پر مجبور کرسکتاہے۔ ختم نبوت کا عقیدہ ایک ایسی نفسیاتی قوت ہے جو اس قسم کے دعوائے اقتدار کا خاتمہ کردیتاہے۔ اب کسی کے باطنی مشاہدات کیسے ہی غیر معمولی کیوں نہ ہوں ان پر اسی طرح تنقیدی نگاہ ڈالی جاسکتی ہے جس طرح انسانی مشاہدات کے دوسرے پہلوؤں پر۔

(علامہ اقبالؒ خطباتِ تشکیل جدید صفحہ ۱۲۰)

ختمِ نبوّت

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۭ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (۶/۱۱۵)

عالمِ طفولیت

بچہ جب پہلے پہل چلنا سیکھتا ہے تو اسے اٹھنے کے بھی کسی آسرے کی ضرورت ہوتی ہے۔ سہارا لے کر اٹھتا ہے اور ابھی دو چار قدم بھی چلنے نہیں پاتا کہ لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے۔ گرتا ہے تو اِدھر اُدھر حسرت بھری نگاہوں سے مدد کی تلاش کرتا ہے۔ مایوس ہو جاتا ہے تو رو کر کسی اٹھانے والے کو پکارتا ہے (کہ اُس وقت اس کے پاس پکارنا ہی ایک ذریعہ ہوتا ہے) کوئی انگلی پکڑ کر اٹھانے والا مل جائے تو پھر چار قدم چل لیتا ہے۔ ذرا اور بڑا ہو جائے تو گنڈیلنے کے سہارے چلتا ہے وہ ہاتھ سے چھوٹ جائے تو پھر مشکل ہو جاتی ہے اور بڑا ہو جائے تو اپنے پاؤں پر کھڑا ضرور ہو جاتا ہے لیکن چلتا پھرتا ان ہی مقامات میں ہے جن سے وہ مانوس ہو جاتا ہے۔ غیر مانوس مقامات کی طرف جانے سے گھبراتا ہے۔ جانا ہی پڑے تو کسی کا ساتھ ڈھونڈتا ہے۔ پھر اگر راستہ میں چھوٹی سی نالی بھی آجائے تو اسے دریا نظر آتی ہے۔ صحن کے نشیب سے برآمدے کا فراز ایک پہاڑ دکھائی دیتا ہے۔ اور بڑا ہو جائے تو دن کی روشنی میں ہر طرف جا نکلتا ہے۔ لیکن اندھیرے میں اُسے ہر طرف چھلاوے نظر آتے ہیں ـــــ اس وقت پھر کسی رفیقِ سفر کی احتیاج محسوس کرتا ہے۔ لیکن جب وہ اسی طرح اٹھتے بیٹھتے، گرتے پڑتے، گھبراتے سنبھلتے، پوری جوانی کو پہونچ جاتا ہے تو اسے انگلی پکڑنے والے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مانوس و غیر مانوس مقامات کا امتیاز اٹھ جاتا ہے۔ روشنی اور اندھیرے کا فرق باقی نہیں رہتا۔ اب وہ ہر جگہ بلا خوف و خطر چلا جاتا ہے۔ اگر کہیں ٹھوکر کھا کر گر بھی پڑے تو خود بخود اٹھنے کی کوشش کرتا ہے اور اس طرح یہ بتانا چاہتا ہے کہ اسے کسی خارجی مدد کی احتیاج نہیں۔ وہ اس مدد کو اپنی شانِ جوانمردی کے خلاف سمجھ کر اس میں خفت محسوس

جوانی کا زمانہ

کرتا ہے۔ وہ اپنے پاؤں آپ چلنا چاہتا ہے۔ وہ اپنی حفاظت خود کرنے کا متمنی ہوتا ہے۔ وہ اپنی منزلیں آپ قطع کرنے میں لذت محسوس کرتا ہے۔ البتہ اس مقام پر اسے ایک چیز کی ضرورت باقی رہتی ہے جس کے بغیر نہ تو وہ راستے کی پُرخطر گھاٹیوں سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ اور نہ ہی منزلِ مقصود تک پہنچ سکتا ہے۔ یہ چیز جس کی ضرورت لاینفک اور جس کی احتیاج یقینی ہے اور اس احتیاج میں وہ کوئی شرم و ندامت اور سُبکی و خفت بھی محسوس نہیں کرتا۔ فقط یہ

ہے کہ شاہراہِ زندگی میں جہاں جہاں دوراہے آئیں، وہاں نشانِ راہ (SIGN POSTS) نصب ہوں جن پر واضح اور بیّن الفاظ میں لکھا ہو کہ یہ راستہ کدھر جاتا ہے اور دوسرا راستہ کس طرف؟ اب اگر راہ رو کی آنکھوں میں بصارت ہو اور فضا میں روشنی کہ جس کی مدد سے یہ نشاناتِ راہ پڑھے جاسکیں تو پھر راستہ قطع کرنے پر منزلِ مقصود تک پہنچ جانا یقینی ہے۔ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون۔

افراد کی طرح نوعِ انسانی کی بھی یہی کیفیت ہے۔ جب ذہنِ انسانی عالمِ طفولیت میں تھا تو اسے چھوٹے چھوٹے معاملات کے فیصلوں کے لئے بھی خارجی امداد کی ضرورت پڑتی تھی۔ وہ دو قدم بھی آسرے کے بغیر نہیں چلتا تھا۔ خدا کی شانِ ربوبیت سے یہ بعید تھا کہ وہ بچے کو یوں تنہا اور بے آسرا چھوڑ دیتا جس خلاقِ فطرت نے اس کی طبیعی زندگی کی پرورش کے لئے یہ انتظام کر رکھا تھا کہ اس کی پیدائش کے ساتھ ہی اس کے لئے دودھ کے چشمے بہہ نکلیں۔ وہ اس کی انسانی زندگی کے تقاضوں کی تسکین سے بے خبر نہیں رہ سکتا تھا۔ اس نے انسان کی اجتماعی زندگی کے آغاز میں کہہ دیا تھا کہ

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ ۙ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۷/۳۵)

اے نوعِ انسانی! جب تمہارے پاس تمہیں میں سے رسول آئیں جو میری آیات تمہیں سنائیں تو تم میں سے جو کوئی تقویٰ اور اصلاح اختیار کرے تو اُن پر کسی قسم کا خوف اور حزن نہیں ہوگا۔

انسانی تمدن و عمرانیت کے دور میں دیکھئے۔ ہدایت آسمانی کا یہ سلسلہ کس طرح غیر منفصل و متواتر چلا آتا ہے۔

ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا (۲۳/۴۴)

پھر ہم نے اپنے رسول پے در پے بھیجے۔

ہر عہد میں رسول، ہر قریہ میں رسول، ہر قوم میں رسول۔ ایک ہی زمانہ میں مختلف بستیوں میں مختلف رسول۔ معارف القرآن کی سابقہ کڑیوں میں تاریخِ رسالت کا جو سلسلہ آپ کے سامنے آچکا ہے اسے ایک مرتبہ پھر دیکھئے۔ یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجائے گی۔ ایک رسول آتا۔ جب تک وہ اپنی قوم یا قبیلے میں رہتا لوگ رشد و ہدایت کی روشنی میں چلتے رہتے۔ جونہی وہ منہ موڑتا وہ رفتہ رفتہ اس آسمانی روشنی کو گم کر دیتے اور پھر اندھیرے میں راستہ ٹٹولنے لگتے۔ مانوس مقامات کے جس قدر دھندلے نقوش ذہن میں محفوظ ہوتے۔ ان میں کہیں کہیں چل پھر لیتے۔ لیکن نہ حتمی طور پر راستہ کا تعین کر سکتے نہ منزل کا اندازہ۔ ایسے میں پھر ایک اور رسول آجاتا۔ پھر روشنی دیکھ لیتے تو سیدھے راستہ پر ہو لیتے كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ ۙ وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا (۲/۲۰) پھر یہ بھی دیکھئے کہ جس طرح بچے کی زندگی کی ضروریات سیدھی سادی اور اس کے تقاضے محدود ہوتے ہیں۔ اسی طرح انسانی حیاتِ اجتماعیہ کے ابتدائی ادوار

میں ان کے معاملات زندگی سادے اور آسان اور ان کے عمرانی تقاضے محدود ہوتے تھے۔ اس لئے آسمانی ہدایت بھی ان ہی محدود مسائل حیات کے لئے متکفل ہوتی تھی۔ پھر ذرائع رسل و رسائل اور اسباب نقل و حرکت کی کمی (بلکہ بعض حصوں میں فقدان) کی وجہ سے ان کی اجتماعی زندگی مختصر قبائل یا چھوٹی چھوٹی اقوام پر مشتمل تھی۔ اس لئے اس آسمانی ہدایت کا دائرہ اثر و نفوذ بھی اسی وسعت کے مطابق محدود و مقید ہوتا تھا۔ مزید برآں ذہن انسانی کی ناپختگی کا تقاضا تھا کہ اس تعلیم کو صرف اصولوں تک ہی محدود نہ رکھا جائے بلکہ اس کی جزئیات تک بھی خود ہی متعین کر دی جائیں کیونکہ ان میں ہنوز اس کی صلاحیت نہ تھی کہ اصولوں کی روشنی میں جزئیات خود مرتب کر لیں۔ الغرض ہوتا یہ کہ ایک رسول کی تشریف براری کے بعد کچھ وقت تک اس کی تعلیم اپنی اصلی شکل میں باقی رہتی۔ پھر اس میں تحریف و الحاق شروع ہو جاتا۔ اُدھر ان کی زندگی کی ضروریات بھی بڑھ جاتیں اور احوال و ظروف کی تبدیلی سے ان کے تقاضوں میں تغیر و تبدل ہو جاتا۔ اس لئے اب بچہ پھر گر پڑتا اور اسے کسی انگلی پکڑ کر اٹھانے والے کا انتظار شروع ہو جاتا۔ اتنے میں پھر ایک رسول آ جاتا۔ وہ سابقہ آسمانی ہدایت کو ذہن انسانی کی آمیزشوں سے پاک صاف کرتا۔ جزئیات میں جہاں کہیں حک و اضافہ ہوتا اور تغیر و تبدل کی ضرورت ہوتی، اسے بھی پورا کرتا اور اس طرح بچے کو اٹھا کر پھر راستے پر لگا دیتا۔ قرآن میں آسمانی ہدایت کے نسخ و تبدل کی آیات پر غور کیجئے یہ حقیقت واضح طور پر سامنے آ جائے گی۔ سورۂ بقرہ میں ہے۔

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا اَوْ مِثْلِهَا ؕ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۲/۱۰۶)

ہم اپنے احکام میں سے جو کچھ بھی منسوخ کر دیتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں تو اس کی جگہ اس سے بہتر یا اس جیسا حکم (پھر) نازل کر دیتے ہیں (پس قرآن کے نزول پر لوگوں کو حیرانی نہیں ہونی چاہیئے) کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ ہر شے پر قادر ہے

سورۂ نحل میں اسی تبدیلیٔ آیات کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے۔

وَاِذَا بَدَّلْنَاۤ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ ۙ وَّاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوْۤا اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُفْتَرٍ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (۱۶/۱۰۱)

اور جب ہم ایک حکم کی جگہ دوسرا حکم بدل دیتے ہیں اور یہ اس لئے کہ اللہ خوب جانتا ہے کہ کب کیا نازل کرنا چاہیئے تو یہ کہتے ہیں کہ تو (اے رسول) افترا کرتا ہے۔ (کیونکہ تیری وحی سابقہ احکام سے بعض جگہ مختلف ہوتی ہے) لیکن ان میں سے اکثر تبدیلیٔ احکام کی علت سے واقف نہیں۔

محو و ثبت کا یہی وہ اصول ہے جس کے متعلق سورۂ رعد میں فرمایا۔

يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ ۚ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ (۱۳/۳۹)

اللہ (اپنے سابقہ احکام میں سے) جو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جو کچھ چاہتا ہے قائم رہنے دیتا ہے۔ اس لئے کہ ام الکتاب (جو تمام قوانین و احکام کا سرچشمہ ہے) اللہ کے پاس ہے۔

باقی رہی انسانی تحریف و الحاق سو اس کے متعلق فرمایا۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۔ (۲۲/۵۲)

اور ہم نے تم سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا اور نہ نبی کہ اس کے ساتھ ایسا نہ ہوا ہو کہ جب اس نے احکام الٰہیہ کی تلاوت کی تو (وحی کے دشمن) شیطان نے اس کی تلاوت کردہ (وحی) میں کچھ ملاوٹ کر دی۔ پس اللہ دوسرا رسول بھیج کر ان کی اس آمیزش کو مٹا دیتا رہا اور اپنے احکام کو محکم کرتا رہا۔ اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے۔

ہدایت آسمانی کا یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا۔ حتیٰ کہ ذہن انسانی رشد و شعور کو پہونچ گیا۔ اب اس میں پختگی آ گئی۔ اب بچہ جوان ہو گیا۔

ذہن انسانی کا سن شعور

اس کے پاؤں میں راستہ طے کرنے کی طاقت۔ دل میں خطرات کا مقابلہ کرنے کے حوصلے اور دماغ میں نشیب و فراز کے سمجھنے کی صلاحیت آ گئی۔ اب ہر چار قدم پر گر کر کسی انگلی پکڑ کر اٹھانے والے کی احتیاج نہ تھی۔ اب صرف اس قدر ضرورت تھی کہ زندگی کے دور لمبے پر نشانات راہ لگا دیئے جائیں۔ اس کے لئے ایسا انتظام کر دیا گیا کہ سفر حیات میں ہر شاہراہ پر، اور شاہراہ کے ہر موڑ پر ایسے ایسے محکم و استوار نشانات نصب کر دیئے کہ حوادث زمانہ کے سیلاب آئیں لیکن روشنی کے بلند میناروں کی طرح نشانات خداوندی کے ان پختہ کھمبوں کو ذرا بھی نقصان نہ پہنچا سکیں۔ ہر شعبۂ حیات کے اصول، ہر گوشۂ زندگی کے آئین، اصولی طور پر قرآن کی دفتین میں محفوظ کر دیئے گئے۔ ان کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے لیا۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝ (۱۵/۹)

یقیناً ہم نے اس قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

ساری دنیا کی قوتیں جمع ہو کر کوشش کریں کہ اس صحیفۂ خداوندی میں ایک نقطے کا بھی تغیر و تبدل کر سکیں تو ناکام و نامراد رہیں۔ یہ محض ہماری خوش عقیدگی نہیں بلکہ تاریخ کے اوراق اس پر شاہد ہیں۔ اپنے اصبے گانے اس پر گواہ ہیں۔ جس کا جی چاہے مسلمانوں سے نہیں غیر مسلموں سے پوچھ لے ان کی شہادات بتا دیں گی کہ عصر حاضر کے نقاد اس پر متفق ہیں کہ قرآن کے موجودہ نسخے اس اصلی نسخہ کا ہو بہو عکس

ہیں جسے (حضرت) زید نے لکھا تھا۔ اور قرآن کا متن بعینہٖ وہی ہے جسے محمدؐ نے (لکھا کر) دیا تھا۔[1]

پہلے صحائف آسمانی چونکہ ایک وقت معین کے لئے نافذ العمل رہنے کے لئے آتے تھے۔ اس لئے ان میں انسانی تلبیسات کی آمیزش ہو جاتی تھی۔ لیکن قرآن چونکہ ہمیشہ کے لئے نافذ العمل رہنے کے لئے آیا تھا۔ اس لئے اس میں باطل کی آمیزش ناممکن تھی۔ اب باطل لوٹ کر نہیں آسکتا تھا۔

قُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيدُ (۳۴/۴۹)

کہو کہ حق آگیا۔ اب باطل نہ پہل کرنے کے لئے (سر اٹھا سکتا ہے) اور نہ لوٹ کر آسکتا ہے۔

تمدنی ضروریات کی وسعتیں

ذہن انسانی کے سن رُشد و شعور کے ساتھ ہی اس کی تمدنی زندگی کی وسعتوں میں بھی اضافہ ہونا شروع ہو گیا اور اس کی حدود اس قدر پھیلنے لگیں کہ وہ رفتہ رفتہ تمام نوع انسانی کو محیط ہونے لگیں۔ چنانچہ آج سامانِ رسل و رسائل اور ذرائع نشر و اشاعت کی ہمہ گیریت کی وجہ سے تمام دنیا سمٹ سمٹا کر ایک بستی اور اس کے رہنے والے ایک خاندان کے افراد بن رہے ہیں۔ اس لئے اب رسالت بھی قومی اور قبائلی ادوار و احصار سے نکل کر عالمگیر بن گئی ہے اور جماعتوں کی بجائے اس کا تخاطب نوعِ انسانی سے ہو گیا۔ قرآن کے صفحات کو الٹئے اور دیکھئے کہ اس نے اس حقیقت کو کس شدت و تکرار سے نمایاں کیا ہے کہ نبی اکرمؐ تمام نوع انسانی کے لئے رسول اور قرآن قیامت تک کے آنے والے انسانوں کے لئے شمع زندگی ہے۔

جب راہ و جادۂ حیات کی ضرورتیں یوں پوری ہو گئیں اور زندگی کی شاہراہوں پر ایسے ایسے محکم نشانات راہ نصب کر دیئے گئے تو دین مکمل ہو گیا۔ نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ انسانیت کی خودداری و خود اعتمادی کا تقاضا تھا کہ اسے اب بچہ تصور نہ کیا جائے۔ ضرورت صرف اس قدر تھی کہ اسے راستے بتا دیئے جائیں۔ نشانات راہ لگا دیئے جائیں۔ فضا میں روشنی پیدا کر دی جائے اور اسے دیکھنے والی آنکھیں عطا کر کے کہہ دیا جائے کہ وہ ان نشاناتِ وحی کی روشنی میں علم

---

[1] HARTWIG HERSCHFIELD. NEW RESEARCHAS INTO THE COMPOSITION AND EXEGESTS OF THE QURAN.

قرآن کی جمع و تدوین اور نشر و اشاعت کی تاریخ اپنے مقام پر آئے گی جہاں اس اجمال کی تفصیل پیش کی جائے گی کہ قرآن میں آج تک ایک حرف کا تغیر و تبدل بھی نہیں ہوا۔

وعقل کی راہ نمائی سے منازلِ زندگی طے کرتا چلا جائے قد تبین الرشد من الغی صحیح اور غلط راہیں متمیز و متفارق ہوگئیں انا ھدینہ النجدین۔ انسان کو زندگی کے ہر موڑ پر دونوں راستے الگ الگ کرکے دکھا دیئے گئے اور اسے چھوڑ دیا گیا کہ ایک مردِ جواں ہمت کی طرح اپنا راستہ خود طے کرے۔ اب ہر معاملہ کی جانچ کے لئے اصول اس کے سامنے تھے۔ ان اصولوں کی روشنی میں جزئی امور کے متعلق فرعی قوانین مرتب کرنے کے لئے علم و عقل اس کے پاس تھی معلم کا کام اصول سمجھا دینا تھا۔ بنیادی قاعدے بتا دینا تھا۔ اگر ہر جزئی سوال کا جواب بھی وہ خود ہی بتا دے تو متعلم میں اصابت رائے، قوتِ فیصلہ، معاملات کی افہام و تفہیم کی صلاحیت اور اعتماد نفس کے جوہر کبھی اجاگر نہ ہو سکیں۔ ذہنِ انسانی کو جلا دینے اور اس کی نگاہوں میں بصیرت اور عقل و خرد میں نشوونما پیدا کرنے کے لئے چاہیئے ہی یہی تھا کہ اسے اصولوں کا مکمل ضابطۂ حیات دے کر کارگہِ ہستی میں آزاد چھوڑ دیا جاتا۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو قوائے عقلیہ مضمحل اور جوہر انسانیہ مفلوج ہو کر رہ جاتے۔ عقل و ہوش کا بچپن کبھی جوانی کی پختگی حاصل نہ کر سکتا۔ اور انسانی قلب و دماغ لاڈلے بچے کے قوائے ذہنیہ و عملیہ کی طرح غیر نشوونما یافتہ (UN - DEVELOPED) رہ جاتے۔ لہٰذا اگر انسانیت کے عہد طفولیت میں قدم قدم پر آسرے اور سہارے بہم پہنچانا ہی تقاضائے ربوبیت تھا تو جوانی کے

اب آسروں کی ضرورت نہ تھی

زمانہ میں اسے اپنے پاؤں چلنے دینا اس کے حق میں رحمت و شفقت۔ اس کے قوائے عقلیہ کے بڑھنے، پھولنے پھلنے کا یہی ایک ذریعہ تھا۔ اس کے جوہرِ مضمر میں جلا پیدا کرنے کا یہی ایک طریقہ تھا۔ نہیں! بلکہ یوں کہیئے کہ انسانیت کی خودداری کا یہی تقاضا تھا۔ کسی نوجوان لڑکے سے بچوں جیسا سلوک کیجئے۔ راستے میں اس کی انگلی پکڑ کر چلایئے۔ اسے گود میں اٹھانے کی کوشش کیجئے۔ دیکھئے اس کی خودداری کو کیسے ٹھیس لگتی ہے۔ وہ کس طرح انگلی چھڑانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ کیسے گود سے اچھل کر بھاگتا ہے۔ فرطِ ندامت سے اس کا چہرہ تمتما اٹھتا ہے۔ احساسِ خودی سے اس کی پیشانی عرق آلود ہو جاتی ہے۔ آپ نے اندازہ فرمایا کہ تکمیلِ دین اور ختمِ نبوت کس طرح اصولِ فطرت کے عین مطابق ہے۔ اگر نبوت کا دروازہ بند نہ کیا جاتا تو ذہنِ انسانی کی کھڑکیاں کبھی نہ کھلتیں۔ انسان اپنے پاؤں چلنا کبھی نہ سیکھتا۔ یہ بچہ کبھی جوان نہ ہونے پاتا۔ چشمِ کائنات نمودِ آدم اور بلوغِ انسانیت سے کبھی روشناس نہ ہو سکتی! ہم نے جب بعثتِ حضور خاتم النبیین کو (حکیم الامتؒ کے الفاظ میں) "ہنگامِ نمودِ آدم" سے تعبیر کیا ہے تو یہ حقیقت کی ترجمانی ہے۔ شاعری نہیں ہے۔ اصل یہ ہے کہ ختمِ نبوت کے عقیدہ نے تاریخِ انسانیت میں ایک نئے باب کا اضافہ اور ایک نئے دور کی ابتدا کی ہے۔ اس سے پہلے مذہب کا تعلق یکسر جذبات (EMOTIONS) سے ہوتا تھا اور اسے عقل کا نقیض سمجھا جاتا تھا۔ اب آفتابِ وحی چشمِ عقل و خرد کے لئے روشنی بن کر آیا اور اس کی دعوت الی اللہ علی وجہ البصیرت قرار پا گئی۔ اب عقل ان مقامات میں وحی کی راہ نمائی کی محتاج رہ گئی جو اس کی رسائی سے ماورا تھے۔ اور یہ مقامات وہ اصولی قوانین تھے جو قرآن کی دفتین میں محفوظ کر دیئے گئے تھے۔ یہ اصول وہ اقدارِ مستقلہ (PERMANENT VALUES) تھیں جن کی حدود کے اندر عقل کی آزادی متصور

تھی۔ گذشتہ اوراق میں اسلامی نظام کے متعلق جو کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اس پر ایک بار پھر نگاہ ڈالئے اور دیکھئے کہ اس کے پیش نظر ختم نبوت کس طرح عین قرینِ عقل عمل (RATIONAL PROCESS) دکھائی دیتا ہے۔ اور اس میں صحیح حریت فکر و نظر کے کس قدر امکانات پوشیدہ ہیں۔ اس سے شخصیت پرستی کا وہ کابوس ٹوٹ گیا جس کے نیچے انسان قرنہا قرن سے دبا چلا آتا تھا۔ اب انسان صرف ان اصولِ حیات کو تنقید سے بالا سمجھتا ہے۔ جسے اس کی عقل وضع نہیں کر سکتی[1]۔ ان اصول زندگی کو صحیح ماننے کے بعد انسان ہر قسم کی شخصی محکومیت (PERSONAL AUTHORITY) سے آزاد ہو جاتا ہے اور اپنا تمام کاروبار اپنی صوابدید کے مطابق آپ چلاتا ہے۔ ثبات (PERMANENCE) اور تغیر (CHANGE) انسانی زندگی کے لاینفک عناصر ہیں۔ غور کیجئے کہ قرآن نے کس طرح ان دونوں میں ایک حسین امتزاج پیدا کر کے نظام زندگی کو فطرت کے ہموار خطوط پر استوار کر دیا ہے۔ اور پھر ان دونوں کو الگ الگ رکھ کر ان میں غیر فطری تلبیس بھی پیدا نہیں ہونے دی۔ یہ صرف ختم نبوت (تکمیل دین اور حفاظتِ کتاب اللہ) ہی سے ممکن تھا۔ ایک چیز انسانی ذات کے تقاضے ہیں جو شروع سے آخیر تک ایک ہی چلے آتے ہیں۔ دوسری چیز ان تقاضوں کے عملی مظاہر ہیں جو احوال و ظروف سے بدلتے رہتے ہیں۔ انسانی ذات کے غیر متبدل تقاضوں کے لئے اصولی قوانین قرآن میں محفوظ کر دیئے گئے۔

اصول و فروعات

ان ہی قوانین کو تمام نوع انسانی کا مشترکہ (اور واحد) دین قرار دیا گیا ہے۔ باقی رہے ان کے عملی مظاہر جو احوال و ظروف اور زمان و مکان کے اثرات سے بدلتے رہتے ہیں اُن کے حل کے لئے ان اصولی قوانین کی روشنی میں وقتی آئین مرتب کرنے کا فریضہ عقلِ انسانی کے سپرد کر دیا گیا۔ تاکہ انسانی حیاتِ اجتماعیہ مستقل اقدار سے بھی الگ نہ ہونے پائے اور اس کے ساتھ ہی نت نئے دن کے بدلنے والے تقاضوں کی تسکین کا سامان بھی بہم پہنچ جائے ان اشارات کی روشنی میں آپ دیکھ سکتے ہیں کہ اب ایک ہی دین کس طرح تمام نوع انسانی کی کفالت کر سکتا ہے (جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے) آج مختلف ایجادات نے زمان و مکان (TIME AND SPACE) کے بُعد کو مٹا کر زمین کی طنابیں اس طرح کھینچ دی ہیں کہ تمام کرۂ ارض ایک وحدت (UNIT) بن چکا ہے۔ آپ ایک مقام پر بیٹھے تمام نوع انسانی تک اپنا پیغام پہنچا سکتے ہیں اور ایک مرکز سے تمام دنیا کا نظام چلا سکتے ہیں۔ آج دنیا کی جغرافیائی حدود بندیاں عہد کہن کی یادگار بن چکی ہیں۔ آج انسان اپنی پیدا کردہ غیر فطری حدود و ثغور سے خود گھبرا اٹھا ہے اور کسی ایسے نظام کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہے۔ جس سے یہ حدود ٹوٹ جائیں اور ساری دنیا ایک وحدت (SINGLE UNIT) میں تبدیل ہو جائے۔ یورپ کے ارباب سیاست اس نظام کا خاکہ ایک عالمگیر فیڈریشن کی شکل میں دیکھ رہے ہیں۔ (FEDERATION AND WORLD ORDER) کا مصنف اس باب میں

وحدتِ نظام

---

[1] اصولِ حیات کو عقل کیوں وضع نہیں کر سکتی۔ اس کے متعلق تفصیلی بحث عنوان دسمی (کتاب ابلیس و آدم) میں گذر چکی ہے۔

لکھتا ہے۔

بُعدِ مکانی مٹ جانے کے بعد انسانی عمرانیت و مدنیت میں جو تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں۔ وہ محیر العقول ہیں۔ ہمارا عمرانی نظام ہمارے اسلاف سے اس قدر مختلف ہو چکا ہے۔ لیکن بایں ہمہ ہمارا سیاسی نظام ابھی تک وہی چلا آتا ہے۔ دنیا سمٹ کر ایک برِ اعظم بن چکی ہیں۔ لیکن دنیا میں قومی حکومتوں کے حدود و قیود بدستور قائم ہیں۔ (اس بوالعجبی کو مٹانے کے لئے) ایک بدیہی طریق کار یہی ہے کہ کوئی ایسا نظام وضع کیا جائے جس سے یہ حدود و قیود مٹ جائیں۔

اسلام اس عالمگیر نظام کی بنیاد وحدتِ فکر کو قرار دیتا ہے اور وحدتِ فکر اسی صورت میں ممکن تھی کہ نوعِ انسانی کے لئے ایک ضابطۂ حیات بطور اصول و اساسِ زندگی دے دیا جاتا اور اس کے بعد نبوت کا دروازہ بند کر دیا جاتا۔ آج چونکہ مغرب سرے سے وحی کی اصولی راہ نمائی کا منکر ہو رہا ہے، اور مشرق کی فکر ایک خواب پریشاں سے زیادہ کچھ نہیں اس لئے دنیا نے ختم نبوت کی اہمیت کا صحیح اندازہ نہیں لگایا۔ جب انسان اپنے صحیح مقام سے آگاہ ہوگا اور ایک طرف ضابطۂ وحی کی اساسی ضرورت اور دوسری طرف عقلِ انسانی کے امکانات کا صحیح صحیح اندازہ لگائے گا تو اس وقت اسے معلوم ہو سکے گا کہ نوعِ انسانی کے عروج و ارتقاء کے لئے ختم نبوت کس قدر ضروری تھی اور اس کے لئے قرآن نے جو نظام عطا کیا ہے وہ انسانیت پر کتنا بڑا احسان ہے۔ اب انسان کو کسی آنے والے کے لئے زحمت کشِ انتظار نہیں ہونا پڑیگا۔

وقت کا سب سے اہم سوال

اسلامک آئیڈیالوجی

کیا ہے؟

اس کا نہایت واضح جواب

قیمت اردو یا انگریزی :- چار آنے

حقائق وعبر

سیلاب یا اللہ کا عذاب

اس دفعہ پھر سیلاب آئے اور حسب معمول ملک تباہی و بربادی کے گرداب میں پھنس گیا۔ اس قسم کے واقعات، ان لوگوں کو جو سر میں عقل و ہوش اور دل میں قوم اور ملک کا درد رکھتے ہیں دعوت غور و فکر دیتے ہیں کہ وہ بل بیٹھ کر سوچیں کہ ان غیر معمولی طغیانیوں کے اسباب و علل کیا ہیں اور ان کا سدباب کس طرح سے کیا جا سکتا ہے۔ دنیا کی ہر سمجھدار قوم ایسے مواقع پر یہی کچھ کرتی ہے اور ان کی کوششیں، اس قسم کے حوادث کا ایسا مداوا کرتی ہیں کہ آئندہ کے لئے ملک تباہی سے محفوظ رہتا ہے۔ اس لئے کہ یہ حوادث اُن قوانین خداوندی کے مطابق رونما ہوتے ہیں جو خارجی کائنات میں کارفرما ہیں۔ انسان کا کام یہ ہے کہ وہ ان قوانین کا مطالعہ کرے اور ان کے مطابق ایسی تدابیر اختیار کرے جن سے یہ حوادث تباہیوں کا موجب نہ بنیں۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ انسان ان قوانینِ فطرت کا مطالعہ کرے اور ان کے مطابق مناسب چارہ جوئی کرے اور پھر بھی کائناتی عناصر اسکے سامنے نہ جھکیں۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں بارہا کہا ہے کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے اُس نے اسے انسان کے لئے تابع تسخیر کر دیا ہے اگر ان میں سے کوئی عنصر ایسا ہے جو انسان کے سامنے جھکتا نہیں تو یہ انسان کی کوتاہیٔ علم و عمل کا نتیجہ ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ انسان علم و تحقیق میں مزید کوشش کرے اور اپنی عملی تدابیر کو موثر سے موثر تر بناتا چلا جائے۔ جن لوگوں نے قرآن کریم کی تعلیم کو اپنایا ہے۔ انھوں نے اس قسم کے حوادث کو اس طرح مسخر کر لیا ہے کہ ان کی جرأت نہیں کہ یہ ان کے سامنے سر اٹھا سکیں۔ ان حوادث سے بچنے کا یہی طریقہ تھا جسے اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرامؑ کو بتایا۔ یعنی طبعی حوادث سے بچنے کے لئے طبعی تدابیر اختیار کرنا۔ مثلاً حضرت نوحؑ کو سیلاب سے بچنے کے لئے کہا گیا۔ فَاَوْحَيْنَا اِلَيْهِ اَنِ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا (۲۳/۲۷) "ہم نے اس کی طرف وحی کی کہ وہ ہماری زیر نگرانی۔ ہماری وحی کے مطابق کشتی بنائے"

یہ تو ہے ویسے حوادث کے سلسلہ میں) خدا کا ارشاد اور قرآن کی تعلیم۔ لیکن دیکھئے کہ ہمارے اربابِ شریعت کا اس باب میں کیا مشورہ ہے۔ جمعیۃ اہل حدیث کا ترجمان "الاعتصام" اپنی ۱۳ر جولائی کی اشاعت میں "سیلاب یا اللہ کا عذاب" کے عنوان

سے رقمطراز ہے۔

"اللہ کی نگاہ ہر چیز پر حاوی اور اس کا علم ہر شے پر محیط ہے۔ وہ مختلف طریقوں سے اپنے بندوں کو آزماتا اور ان کا امتحان لیتا ہے کسی کو رزق کی تنگی میں مبتلا کر دیتا ہے کہیں قحط کے آثار پیدا کر دیتا ہے اور کسی کو اولاد کی دولت سے محروم کر دیتا ہے۔ ولنبلونکم بشیء من الخوف والجوع ونقص من الاموال والانفس والثمرات وبشر الصابرین لیکن اللہ کے نیک بندے کسی مصیبت سے نہیں گھبراتے۔ ہر دم خوش رہتے ہیں۔ مصائب و مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہو رہا ہے۔ ان پاکیزہ خیالات کے حامل اللہ کے نیک بندے ہیں اور اس کی رحمت کے مستحق۔ الذین اذا اصابتھم مصیبۃ قالوا انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اولئک علیھم صلوۃ من ربھم ورحمۃ واولئک ھم المھتدون یہ سیلاب کی مصیبت بھی اسی کی طرف سے ہے۔ اس میں کسی بشر کی اسی کے حکم اور اسی کی مرضی و منشاء سے ہو رہی ہے۔ آپ دیکھتے نہیں دریاؤں کا پانی کناروں سے اچھل پڑا ہے۔ ندی نالوں میں طغیانی آگئی ہے اور نہروں کے چوڑے اور مضبوط بند ٹوٹ گئے ہیں جس کی وجہ سے دیہات کے دیہات تباہ ہو گئے ہیں۔ بڑے بڑے شہروں کی مضبوط عمارتیں متزلزل ہو گئی ہیں۔ ریل کی پٹڑیاں پانی کے بے پناہ زور کے آگے شکست کھا گئی ہیں اور سڑکوں میں جگہ جگہ بڑے بڑے سوراخ پڑ گئے ہیں۔ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور اسی کی حکم و اشارہ سے ہو رہا ہے۔ اس کی قدرتِ کاملہ اور بے پروائی کے ایمان افروز کرشمے ملاحظہ ہوں کہ کہیں تو زمین کے سینہ پر دور دور تک پانی کی ایک طویل و عریض چادر بچھی ہوئی دکھائی دیتی ہے اور کہیں پانی کا نشان تک نہیں اور زمین پانی کے ایک ایک قطرے کو ترس رہی ہے۔ معلوم ہوتا ہے سیلاب کی صورت میں یہ اللہ کا عذاب ہے جس نے پاکستان اور ہندوستان دونوں ملکوں کی بہت بڑی آبادی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اور جان و مال کا عظیم نقصان کر ڈالا ہے۔ اللہ کے حضور پورے خشوع و خضوع سے دعا کرنی چاہیئے کہ وہ اس ابتلائے عظیم سے اپنے بندوں کو جلد نجات دے اور ان کی لغزشوں کے بدلے ان کو اس ہولناک مصیبت میں زیادہ دیر تک مبتلا نہ رکھے۔ ہم ناتواں اور کمزور بندے اس آزمائش کو برداشت کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ صرف ایک مہینہ میں سیلاب نے دو دفعہ حملہ کیا ہے۔ نہ معلوم آئندہ پردۂ غیب سے کیا نمودار ہونے والا ہے تو یہ وانابت اور اللہ کا خوف و خشیت ہر شخص پر لازم ہے"۔ (الاعتصام۔ لاہور)

آپ نے غور فرمایا کہ یہ حضرات ایسے مواقع پر قوم کو کیا تعلیم دیتے اور کیا تلقین کرتے ہیں؟ یہ کہتے ہیں کہ

(۱) سیلاب کی مصیبت اللہ کی طرف سے آتی ہے ـــــ یعنی اس میں ہماری غفلت، کم علمی، بے تدبیری، عدم صلاحیت فقدانِ عمل وغیرہ کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ یہ یونہی اللہ کی طرف سے آجاتی ہے!

(۲) یہ خدا کی قدرتِ کاملہ اور بے پروائی کے کرشمے ہیں ـــــ یعنی خدا کو (معاذ اللہ) اس کی بھی پرواہ نہیں کہ اس سے اسکے بندوں پر کس قدر تباہی اور بربادی آتی ہے۔ "بے پرواہ" کے الفاظ جس قسم کے خدا کا تصور ذہنوں میں پیدا کرتے ہیں وہ ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں۔ یعنی اس کے ہاں نہ کوئی قاعدہ ہے نہ قانون۔ نہ ضابطہ ہے نہ آئین۔ وہ (معاذ اللہ) ایک مطلق العنان

ڈکٹیٹر ہے جو جی میں آیا حکم دیدیا۔ یہ اس خدا کے متعلق کہا جا رہا ہے جو خود اپنے متعلق کہتا ہے کہ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (۳۳/۶۲) تو خدا کے قانون میں کوئی تبدیلی نہیں پائے گا۔

(۳) ایسی تباہیوں اور بربادیوں سے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو آزماتا ہے اور ان کا امتحان لیتا ہے ــــ یعنی اُس کے بندے اس کے احکام کے مطابق زندگی بسر کر رہے ہوتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انھیں زندگی کی خوشحالیاں نصیب ہوتی ہیں کہ اتنے میں اللہ میاں کا جی چاہتا ہے کہ انھیں آزمائے وہ اس آزمائش کے لئے ان بندوں پر طرح طرح کے عذاب نازل کر دیتا ہے اور دیکھتا ہے کہ ان میں سے کون ان مصیبتوں سے نہیں گھبراتا بلکہ خوش ہوتا ہے! آپ نے غور فرمایا کہ یہ تعلیم خدا کے متعلق کس قسم کا تصور پیدا کرتی ہے؟ اُس خدا کے متعلق جس نے کہا ہے کہ وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ (اللہ ایک بستی کی مثال دیکر بات سمجھاتا ہے)۔ وہ امن اور اطمینان کی حالت میں تھی اس کا رزق ہر طرف سے بافراغت اسکی طرف چلا آتا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے اللہ کی نعمتوں کا کفران کیا تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ (۱۶/۱۱۲) "اللہ نے اسے بھوک اور خوف کے عذاب کا مزہ چکھایا، ان کے اعمال کی وجہ سے"۔ اس سے ظاہر ہے کہ بھوک اور خوف خدا کا عذاب ہے جو کسی قوم پر اس کے اپنے اعمال کی وجہ سے آتا ہے۔ یہ نہیں کہ کسی قوم کے اعمال بالکل ٹھیک ہوں اور اللہ تعالیٰ انھیں بیٹھے بٹھائے آزمانے کے لئے ان پر عذاب نازل کر دے۔ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ کا ٹکڑا خدا کے اس محکم قانون کا اعلان کر رہا ہے کہ کسی قوم پر تباہی اسکی اپنی کرتوتوں کی وجہ سے آتی ہے۔ اس ضمن میں معاصر موصوف نے قرآن کریم کی جو آیت درج کی ہے وہ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا (۲/۲۶) کی زندہ شہادت ہے۔ مصیبتوں کی ایک شکل تو وہ ہے جس کا ذکر سورۂ نحل کی اُس آیت (۱۶/۱۱۲) میں کیا گیا ہے جسے ہم نے اوپر درج کیا ہے یعنی کسی قوم کے غلط اعمال کی وجہ سے اس کا تباہیوں اور بربادیوں میں گھر جانا۔ دوسری شکل یہ ہے کہ ایک جماعت اعلائے کلمۃ الحق (خدا کے نظام کے قیام) کے لئے اٹھتی ہے۔ مخالفین اسکے مقابلہ میں اپنی پوری قوت صرف کر دیتے ہیں۔ اس مقابلہ میں (جس میدانِ جنگ میں شمشیر و سنان کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے) ان پر طرح طرح کی مشکلات آتی ہیں۔ یہ ہیں وہ مشکلات جن کا ذکر سورہ بقرہ کی اس آیت (۲/۱۵۵) میں کیا گیا ہے جسے الاعظم نے درج کیا ہے چنانچہ اس آیت سے پہلی آیت یہ ہے وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَاءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ (۲/۱۵۴) "جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کئے جائیں انھیں مُردہ مت کہو۔ وہ زندہ ہیں لیکن تم اس کا شعور نہیں رکھتے"۔ دشمن کے مقابلہ میں بھوک۔ پیاس۔ کھیتوں کا اجڑنا۔ مال و دولت کا لُٹ جانا۔ ابتدائی مشکلات ہیں اور ان کی انتہا جانوں کا چلے جانا ہے۔

آپ سوچئے کہاں یہ مشکلات اور کہاں وہ مصائب جو کسی قوم پر اسکی غلط کاریوں کی وجہ سے آئیں!

(۴) سیلاب کی تباہیوں سے بچنے کی تدبیر یہ بتائی جا رہی ہے کہ لوگ توبہ و استغفار کریں اور خشوع و خضوع سے دعا کریں کہ ہم کمزور بندے اس آزمائش کو برداشت کرنے کے قابل نہیں ہیں[1] ــــ توبہ و استغفار کے قرآنی مفہوم سے کسے انکار ہو سکتا ہے لیکن ہر بات

[1] ہم اسے برداشت کرنے کے قابل نہیں۔ اس عذاب کو ان لوگوں پر نازل کر جو اسے برداشت کرنے کی طاقت رکھتے ہوں؟ (معاذ اللہ)

کے لئے ایک موقع و محل ہوتا ہے۔ ذرا سوچئے جن معنوں میں ہمارے ارباب شریعت "توبہ و استغفار" کے الفاظ استعمال کرتے ہیں اور اس کا جو طریق ان کے ہاں مروج ہے اسے دریاؤں کے سیلاب سے کیا واسطہ اور انہیں روکنے سے کیا تعلق ہے؟ ان کے ہاں توبہ سے مراد یہ ہوتی ہے کہ انسان سے جب گناہ سرزد ہو جائیں تو وہ خدا سے ان گناہوں کی معافی مانگے۔ گناہوں سے انکی مراد فسق و فجور ہوتی ہے۔ مثلاً ایک شخص شراب پیتا ہے تو وہ گناہ کرتا ہے اسے چاہیئے کہ اللہ سے اپنے اس گناہ کی معافی مانگے اسے توبہ کہا جاتا ہے۔

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ ان حضرات کے نزدیک سیلاب اس لئے آتے ہیں کہ لوگ فسق و فجور کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہ مفروضہ ہی غلط ہے۔ سیلاب کو فسق و فجور کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ یورپ کی قومیں اس قدر فسق و فجور کی زندگی بسر کرتی ہیں لیکن چونکہ انہوں نے سیلاب روکنے کی تدابیر اختیار کر رکھی ہیں اس لئے وہاں سیلاب نہیں آتے۔ اگر کبھی سیلاب آ جائے تو وہ فوراً یہ سوچتے ہیں کہ ہماری تدبیر میں کس جگہ کمزوری آ گئی ہے؟ اس کمزوری کو رفع کر دیتے ہیں اور سیلاب رک جاتا ہے۔ "استغفار" پڑھنے یا (ہمارے مروجہ مفہوم کے مطابق) دعائیں مانگنے سے سیلاب نہیں رکا کرتے۔

یاد رکھئے!

(۱) سیلاب خدا کی "بے پروائی" سے نہیں آتے۔ خدا کے محکم قانون کے مطابق آتے ہیں۔ اس کا قانون یہ ہے کہ جو قوم اپنے دریاؤں کو گہرا کر لے اور ان کے کناروں کو بلند اور مضبوط کر لے یا ایسی ہی دیگر تدابیر اختیار کرے، وہ قوم سیلاب سے محفوظ رہ جاتی ہے جو ایسا نہ کرے وہ تباہیوں میں گرفتار ہو جاتی ہے۔

(۲) سیلاب کی تباہی قومی جرائم کی وجہ سے آتی ہے۔ یعنی قانونِ فطرت سے بے خبر رہنا اس کے مطابق عمل نہ کرنا اپنی حفاظتی تدابیر کی طرف سے غفلت برتنا۔ ہم دس برس تک ان جرائم کے مرتکب ہوتے رہے ہیں اس لئے ان کا خمیازہ بھگت رہے ہیں۔

(۳) سیلاب روکنے کی تدبیر یہ ہے کہ ہم اپنے (مذکورہ بالا) قومی جرائم سے باز آ جائیں (اسے توبہ کہتے ہیں) اور آئندہ کے لئے صحیح روش اختیار کریں (اسے تائب کے بعد اصلاح کہتے ہیں) یعنی سیلاب روکنے کی ضروری تدابیر اختیار کریں۔ (واضح رہے کہ ہم یہ نہیں کہتے کہ ہمیں فسق و فجور سے باز نہیں رہنا چاہیئے۔ ہمارا کہنا یہ ہے کہ "فسق و فجور" کو کائناتی حوادث سے کوئی تعلق نہیں۔ اگر کوئی قوم فسق و فجور سے محتاط رہتی ہے لیکن سیلاب روکنے کی تدابیر نہیں کرتی تو سیلاب اس پر تباہیاں لائیں گے۔ اس کے برعکس اگر کوئی قوم فسق و فجور کی زندگی بسر کرتی ہے لیکن سیلاب سے بچنے کی تدابیر اختیار کر لیتی ہے تو وہ سیلاب کی تباہیوں سے بچ جائیگی البتہ اس کا فسق و فجور اس پر اور قسم کی تباہیاں لائے گا۔

(۴) سیلاب یا ایسے ہی کائناتی حوادث فطرت کی طرف سے انسان کی قوتِ مدافعت کے لئے چیلنج ہوتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ کوئی قوم اس چیلنج کا کیا جواب دیتی ہے۔ اسے "ابتلا" یا آزمائش کہتے ہیں۔ یعنی ایسے مواقع پر خدا انسانوں کو نہیں آزماتا۔ ان مواقع پر انسان خود اپنی قوت کو آزماتا ہے کہ وہ ان حوادث کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو چکی ہے یا نہیں؟

یہ ہے اس باب میں قرآن کی تعلیم۔

باسمہ تعالیٰ

وقت کا سب سے اہم سوال

اسلامک آئیڈیالوجی

کیا ہے؟

اور اس کا نہایت واضح جواب

ادارہ طلوع اسلام، لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سلیمؔ کے نام

اسلامک* آئیڈیالوجی کیا ہے؟

سلیم میاں! تمہارے سوال کا صاف اور سیدھا جواب تو یہ تھا کہ میں نے اس موضوع پر جو کچھ آج تک لکھا ہے اُسے غور سے پڑھو اور جو باتیں سمجھ میں نہ آئیں یا جو مزید وضاحت چاہتی ہوں، وہ مجھ سے پوچھ لو۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ تم اتنی محنت کبھی نہیں کرو گے اور جو خلش تمہارے دل میں پیدا ہو رہی ہے وہ ویسے کی ویسی ہی رہ جائے گی۔ بلکہ اس کی شدت اور بھی بڑھ جائے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس میں تمہارا خاص قصور بھی کچھ نہیں۔ "خلاصوں" کی مدد سے امتحان پاس کرنے کی عادت نے ہمارے نوجوانوں کو اس قدر سہل انگار بنا دیا ہے کہ وہ خود محنت کر کے کسی بات کی تہہ تک پہنچنے کے عادی ہی نہیں رہے۔ وہ چاہتے یہ ہیں کہ سب کچھ پکا پکایا ان کے سامنے آجائے۔ لہٰذا مجھے تمہارے سوال کا جواب دینا ہی ہوگا۔ اسے غور سے پڑھنا اور سنبھال کر رکھنا۔ میں اس موضوع پر جو کچھ برسوں سے لکھتا چلا آیا ہوں، اسے اس کا خلاصہ (SUMMARY) سمجھو۔

آئیڈیالوجی کے معنی

تمہارا سوال یہ ہے کہ اسلامک آئیڈیالوجی (ISLAMIC IDEOLOGY) کسے کہتے ہیں؟ لیکن میں اگر تم سے پوچھوں کہ (اسلامک آئیڈیالوجی تو خیر بعد کی چیز ہے تم بتاؤ کہ) خود "آئیڈیالوجی" کے کیا معنی ہیں؟ تو مجھے یقین ہے کہ تم بغلیں جھانکنے لگ جاؤ گے۔ فلسفہ کی زبان میں آئیڈیالوجی کہتے ہیں (SCIENCE OF IDEAS) کو۔ یعنی علم کی وہ شاخ جس کا تعلق (IDEAS) سے ہے۔ اب اگر تم پوچھو کہ (IDEA) کسے کہتے ہیں تو اس کا جواب ایک خط میں نہیں دیا جا سکتا۔ یہ ایک فنی مسئلہ ہے اور بڑی مشکل اصطلاح۔ جس کی تاریخ اور تشریح کے لئے طویل فرصت چاہیئے۔ تم ان فلسفیانہ موشگافیوں کو چھوڑو اور سیدھے سادے لفظوں میں یوں سمجھو کہ

> وہ بنیادی تصورات (CONCEPTS) جن پر کسی نظام (SYSTEM)
> کی عمارت استوار ہو، اُس نظام کی آئیڈیالوجی کہلاتے ہیں۔

لہٰذا اسلامک آئیڈیالوجی کے معنی ہوں گے وہ بنیادی تصورات جن پر اسلامی نظام کی عمارت استوار ہوتی ہے۔

اب تم پوچھو گے کہ یہیں اسلام کے ساتھ لفظ "نظام" کیوں لایا ہوں؟ نظام کے معنی ہوتے ہیں (اس زبان میں جسے تم آسانی سے سمجھ لیتے ہو) سسٹم (SYSTEM) یا (ORDER) لہٰذا "اسلامی نظام" کے معنی ہوں گے (ISLAMIC SYSTEM) یا (ISLAMIC ORDER)۔ اسی کو اسلامی طریق زندگی (ISLAMIC WAY OF LIFE) کہا جاتا ہے۔ یہ نکتہ غور طلب ہے کہ اسلام کے ساتھ لفظ نظام کیوں لایا جاتا ہے؟

میں تمہیں اس سے پہلے بھی کئی بار بتا چکا ہوں کہ اسلام، مذہب (RELIGION) نہیں، الدین ہے۔ قرآن کریم

مذہب اور دین میں فرق

میں "مذہب" کا لفظ تک نہیں آیا۔ اس نے اسلام کو "الدین" کہہ کر پکارا ہے۔ مذہب (RELIGION) اور الدین میں فرق کیا ہے۔ اسے سمجھ لینے سے یہ بات واضح ہو جائیگی کہ اسلام کے ساتھ لفظ "نظام" کیوں لایا گیا ہے۔

مذہب یا (RELIGION) کا بنیادی تصور یہ ہے کہ خدا (یعنی کوئی ایسی ہستی جسے انسان اپنے ذہن میں خدا تصور کرلے) کائنات سے کہیں الگ بیٹھا ہے۔ اس کی کیفیت ایک بادشاہ (یا ڈکٹیٹر) کی سی ہے۔ جب بادشاہ کسی سے ناراض ہو جائے تو وہ شخص عتاب میں آجاتا ہے۔ اس پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے۔ ان مصیبتوں سے بچنے کا طریق صرف ایک ہی اور وہ یہ کہ کسی نہ کسی طرح بادشاہ کی خوشنودی حاصل کرلی جائے۔ اس کے لئے اس کی حمد و ستائش کے قصیدے پڑھنے چاہئیں۔ اس کی خوشامد کرنی چاہیئے۔ اس کے حضور نذرانے پیش کرنے چاہئیں، جو ان کے مقرب ہوں ان سے اس تک سفارشیں پہنچانی چاہئیں۔ جب اس طرح بادشاہ کو خوش کر لیا جائے تو پھر نہ صرف وہ مصیبتیں ٹل جاتی ہیں بلکہ انعام و اکرام بھی ملتا ہے۔ وہ جاگیریں بخش دیتا ہے اپنا مقرب بنا لیتا ہے۔ جاہ و مناصب عطا کر دیتا ہے۔ چونکہ ذہن انسانی کے تراشیدہ خدا کا تصور، بادشاہ کا سا ہوتا ہے اس لئے "خدا کے پرستار" اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے وہ سب کچھ کرتے ہیں جو ایک بادشاہ کی رضا جوئی حاصل کرنے کے لئے کیا جاتا ہے۔ اسے مذہبی مراسم یا پوجا پاٹ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

یہ ظاہر ہے سلیم! کہ خدا کے اس تصور کے ماتحت کسی نظام کی ضرورت ہی لاحق نہیں رہتی۔ اس میں ایک فرد کا "اپنے خدا" کے ساتھ پرائیویٹ تعلق ہوتا ہے۔ وہ فرد، تنہائی میں بیٹھ کر، اپنی مصیبتوں کے ازالے اور بخشش کے حصول کے لئے خدا سے منت سماجت کرتا ہے اور وہاں سے فارغ ہو کر دنیا کے دھندوں میں لگ جاتا ہے۔

اسے مذہب یا (RELIGION) کہتے ہیں۔ یہ انسانوں کے اپنے ذہن کا پیدا کردہ تصور ہے اور اس قدیم زمانے کا پیدا کردہ جب انسان، کائنات کی مہیب قوتوں (بجلی۔ بادل۔ سیلاب۔ آگ۔ امراض وغیرہ) کے اسباب سے واقف اور ان کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں تھا۔ اس زمانے میں اسے اپنے سے زیادہ طاقتور سے ڈرنے اور اس کے سامنے گڑگڑانے کے سوا کچھ نہیں آتا تھا۔

لیکن خدا کا جو تصور حضرات انبیاء کرامؑ کے ذریعے (وحی کی رُو سے) ملا۔ وہ اس سے بالکل مختلف تھا۔ اس کی رُو سے خدا اس ہستی کا نام ہے جو کائنات کے عظیم سلسلے کو اپنے اٹل قوانین کے مطابق چلا رہا ہے۔ ان قوانین کے مطابق ہر شے اپنی ابتدائی حالت سے ترقی کرتی اور نشوونما پاتی اپنی آخری منزل تک پہنچ جاتی ہے (جس طرح بیج، نشوونما پاکر آہستہ آہستہ درخت بن جاتا ہے)۔ خدا نے جس طرح کائنات کی باقی اشیاء کی نشوونما کے لئے قوانین عطا کئے ہیں، اسی طرح اس نے انسانوں کی نشوونما کے لئے بھی قوانین دیئے ہیں۔ جو لوگ ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں وہ نشوونما پاکر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ جو ان کے خلاف چلتے ہیں، وہ تباہ اور برباد ہو جاتے ہیں (جس طرح اس بیج کا ستیاناس ہو جاتا ہے جسے قانونِ فطرت کے خلاف سخت زمین میں دبا دیا جائے)

قوانین خداوندی

اس سے تم نے سمجھ لیا ہوگا سلیم! کہ خدا کے اس تصور کی رُو سے جو اس نے وحی کی رُو سے عطا کیا ہے (اور ظاہر ہے کہ خدا کا وہی تصور صحیح ہو سکتا ہے جسے وہ خود انسانوں کو بتائے) انسان کا خدا سے تعلق درحقیقت اُن قوانین سے تعلق ہے جو اس نے انسانوں کی نشوونما کے لئے متعین کئے ہیں۔ خدا کی ذات کی کنہ و حقیقت کو انسانی ذہن سمجھ نہیں سکتا۔ ہم صرف ان قوانین کو سمجھ سکتے ہیں جو خدا نے ہماری نشوونما کے لئے ہمیں دیئے ہیں۔ اس ضابطۂ قوانین کا نام قرآنِ کریم ہے۔ یہ انسانوں کی راہ نمائی کے لئے آخری، مکمل اور واحد ضابطۂ قوانین ہے۔

یہ بھی ظاہر ہے سلیم! کہ جب کوئی فرد تنہا زندگی بسر کرے تو اسے کسی قاعدے اور قانون کی پابندی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ قانون کی پابندی کی ضرورت اس وقت پڑتی ہے جب انسان مل جل کر رہیں۔ جنگل میں کوئی دائیں طرف چلے یا بائیں طرف، اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ لیکن شہر کی سڑکوں پر اگر قاعدے اور قانون کے خلاف چلا جائے تو نتیجہ فوراً سامنے آجاتا ہے۔ خدا نے انسان کی راہ نمائی کے لئے قوانین دیئے ہی اس لئے ہیں کہ انسانوں نے مل جل کر رہنا ہے۔ جب بہت سے انسان کسی قاعدے اور قانون کے مطابق مل جل کر رہیں تو اسے نظام، سسٹم یا (ORDER) کہتے ہیں اسے قرآن نے الدین سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی وہ نظام جس میں انسان اجتماعی طور پر قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کریں۔

اس سے سلیم! یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ

(۱) مذہب اور الدین میں فرق کیا ہے ـــــ مذہب خدا اور بندے کے درمیان پرائیویٹ تعلق کا نام ہے جسے انسانوں کی اجتماعی زندگی سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس کے برعکس، الدین اس نظامِ خداوندی کا نام ہے جس کے مطابق اجتماعی زندگی بسر کی جائے۔

(۲) اسلام، مذہب نہیں۔ الدین ہے۔

(۳) اسی کو اسلامی نظام کہتے ہیں۔ یعنی وہ اجتماعی طریق جس میں زندگی قوانین خداوندی کے مطابق بسر

کی جائے۔ اور

(۴) اسلامک آئیڈیالوجی کے معنی ہیں وہ بنیادی تصورات جن پر اسلامی نظامِ زندگی کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ اسے فلسفۂ زندگی۔ نصب العین حیات، منزلِ مقصود۔ وغیرہ اصطلاحات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے اسے "کلمہ" کہہ کر پکارا ہے (یعنی نظریۂ زندگی) اور اس کے ساتھ لفظ "طیب" کا اضافہ کرکے اسے درخت سے تشبیہ دی ہے۔

کلمۂ طیبہ کا مفہوم

"طیب" کے عام معنی تو خوشگوار کے ہیں لیکن یہ لفظ اس درخت کے لئے بھی بولا جاتا ہے جو نہایت عمدہ پھل دے۔ سورۂ ابراہیم میں ہے مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ. أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ. تُؤْتِي أُكُلَهَا كُلَّ حِينٍ بِإِذْنِ رَبِّهَا..... (۱۴/۲۴) کلمہ طیبہ کی مثال ایک شجرِ طیب کی ہے جس کی جڑیں (پاتال میں) محکم ہوں اور اس کی شاخیں آسمان (کی بلندیوں) میں پھیل رہی ہوں۔ اور وہ قانونِ خداوندی کے مطابق ہر زمانے میں اپنے پھل دیتا چلا جائے۔

یہ ہے سلیم! اسلامک آئیڈیالوجی۔ یعنی وہ تصوراتِ حیات جو اپنے مقام پر محکم اور اٹل ہوں اور جو نظام ان کی بنیادوں پر قائم کیا جائے وہ مکان (یعنی SPACE) کی حدود (LIMITATIONS) سے بے نیاز ہو کر ساری دنیا کو محیط ہو۔ اور اس کے انسانیت پرور نتائج، زمان (TIME) کی قیود سے بلند ہو کر، ہر زمانے میں تازہ بتازہ سامنے آتے رہیں۔ اس مثال کو سلیم! اچھی طرح سے ذہن نشین کر لو کیونکہ آگے چل کر اس سے ایک اہم اصول سامنے آئے گا۔

آئیڈیالوجی اور عمل

"درخت" کی مثال میں سلیم! ایک اور نقطہ بھی قابلِ غور ہے۔ درخت کے لئے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اس کا بیج عمدہ ہو۔ اس میں بڑھنے۔ پھولنے اور پھیلنے کی صلاحیت ہو۔ اس کے بعد یہ ضروری ہے کہ اس بیج کی نشوونما کے لئے ایک پروگرام کے مطابق محنت کی جائے۔ اس کے لئے زمین تیار کی جائے۔ کھاد ڈالی جائے۔ پانی دیا جائے۔ حرارت اور روشنی کا انتظام کیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ اسے موسموں کی شدت سے بچایا جائے۔ جانوروں کی یورش سے محفوظ رکھا جائے۔ دیکھو سلیم! قرآن اس عظیم حقیقت کو کس انداز میں بیان کرتا ہے جب وہ کہتا ہے کہ إِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ۔ (خدا کی طرف سے عطا کردہ) خوشگوار نظریۂ زندگی (آئیڈیالوجی) میں اس کی صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ "خدا کی طرف" بلند ہوتا چلا جائے۔ یعنی اُن بلندیوں تک پہونچ جائے جو خدا نے اس کے لئے مقرر کی ہیں لیکن وہ از خود ایسا نہیں کر سکتا۔ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ (۳۵/۱۰) انسان کا عمل صالح اسے بلندیوں کی طرف لے جاتا ہے۔ یعنی اس کے لئے اس عملی پروگرام کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کی مناسب نشوونما کر سکے۔ قرآن کی اصطلاح میں آئیڈیالوجی کو ایمان اور اسے کامیاب بنانے کے لئے عملی پروگرام کو اعمالِ صالحہ کہا جاتا ہے۔

اس سے ظاہر ہے سلیم! کہ کلمہ طیبہ یا آئیڈیالوجی، اسلامی نظام کا نصب العین ہوتا ہے۔ اور اعمالِ صالحہ وہ پروگرام

جائیں نظام پر چلنے والوں کو اُس نصب العین تک لے جائے۔ دورِ حاضر کی اصطلاح میں یوں سمجھو کہ کلمہ طیبہ یا آئیڈیالوجی اسلامی مملکت کی قرارداد مقاصد (OBJECTIVE RESOLUTION) ہوتی ہے۔ اس کا آئین (CONSTITUTION) اس قرارداد کو سیاسی پیکر عطا کرتا ہے اور مملکت کے قوانین کاروانِ امت کو اُس منزل تک لے جانے کا پروگرام متعین کرتے ہیں۔

یہ ہے سلیم! اسلامک آئیڈیالوجی کی (DEFINITION) یعنی

وہ بنیادی تصورات جن پر اسلامی نظامِ زندگی کی عمارت استوار ہوتی ہے۔

یا

وہ نصب العین جس تک پہنچنا اسلامی معاشرہ کا مقصودِ حیات ہوتا ہے۔

جو کچھ کہا گیا ہے اچھی طرح سمجھ لو۔ اس لئے کہ یہ مشاعرہ نہیں کہ تم جب جی چاہے مکرر کہہ دو اور میں شعر دہرانے پر مجبور ہو جاؤں۔ یہ باتیں روز روز نہیں لکھی جا سکتیں۔

اب آگے بڑھو اور یہ سمجھو کہ یہ تصورات یا نصب العین ہے کیا؟

زندگی کے متعلق دو نظریئے میں تمہیں اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ بتا چکا ہوں کہ زندگی کے متعلق ایک نظریہ یہ ہے کہ انسان بھی دیگر حیوانات کی طرح صرف طبیعی جسم (PHYSICAL BODY) رکھتا ہے اس کا جسم فطرت کے طبیعی قوانین (PHYSICAL LAWS OF NATURE) کے مطابق زندہ رہتا ہے اور کچھ وقت کے بعد انہی قوانین کے مطابق اس کی مشینری چلنے سے رُک جاتی ہے۔ اسے اس کی موت کہتے ہیں جس سے اُس فرد کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اس نظریہ کو میکانکی تصورِ حیات یا (MECHANISTIC CONCEPT OF LIFE) کہتے ہیں۔ جو نظام اس نظریہ کے مطابق قائم ہوتا ہے اس کا نصب العین یا مقصود یہ ہوتا ہے کہ اس مملکت کی حدود میں رہنے والے افراد کی جسمانی پرورش کا انتظام کرے۔ اچھی مملکت وہ ہوتی ہے جس میں افراد کی پرورش کا انتظام اچھا ہو۔ یعنی ہر ایک کو سامانِ زندگی فراوانی سے اور بسہولت ملتا جائے۔

مادی نظریۂ زندگی اس نظریہ کو حیوانی سطحِ زندگی (ANIMAL LEVEL) قرار دیتا ہے اور کفر سے تعبیر کرتا ہے۔ سورۂ محمدؐ میں ہے وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ۔ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ (۴۷/۱۲) اور جو لوگ (انسانی نظریۂ زندگی سے) انکار کرتے ہیں ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ دنیاوی سامانِ زندگی سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور کھاتے پیتے ہیں (بالکل اس طرح) جس طرح حیوانات کھاتے پیتے ہیں۔ ان کا مقام جہنم کی آگ ہے (جس میں شرفِ انسانیت کی کھیتی جل کر راکھ ہو جاتی ہے)

دوسرا نظریہ زندگی یہ ہے کہ انسان صرف طبیعی جسم سے عبارت نہیں۔ اس کے پاس جسم کے علاوہ ایک اور شے بھی ہے جو حیوانات کو نہیں ملی۔ صرف انسان کو عطا ہوئی ہے۔ اسے انسانی ذات (HUMAN PERSONALITY) یا نفس (SELF) کہتے ہیں۔ انسانی ذات نہ مادی ارتقاء (MATERIAL EVOLUTION) کی پیداوار ہے اور نہ طبیعیاتی قوانین (PHYSICAL LAWS) کے تابع۔ یہ ہر انسانی بچے کو ـــــ خواہ وہ بادشاہ کے محل میں پیدا ہو یا فقیر کی جھونپڑی میں۔ برہمن کے گھر میں ہو یا شودر کے۔ اس کے ماں باپ مسلمان ہوں یا غیر مسلم ـــــ خدا کی طرف سے پیدائش کے ساتھ عطا ہوتی ہے۔ انسانی ذات نشوونما یافتہ شکل (DEVELOPED FORM) میں نہیں ملتی بلکہ مضمر (POTENT) اور امکانی (REALISABLE POSSIBILITIES) صورت میں ملتی ہے۔ جس طرح انسانی جسم کی نشوونما کے لئے قوانین مقرر ہیں۔ اسی طرح انسانی ذات کی نشوونما کے لئے خدا کی طرف سے (قرآن کریم میں) قوانین دیئے گئے ہیں۔ اگر ان قوانین کے مطابق انسانی ذات کی نشوونما ہوتی چلے تو اس میں حدودِ بشری کے اندر ان صفات کی نمود (MANIFESTATION) ہوتی جاتی ہے جنہیں (لامحدود حیثیت سے) صفاتِ خداوندی کہا جاتا ہے۔ نشوونما یافتہ ذات، انسانی جسم کی موت کے ساتھ فنا نہیں ہو جاتی بلکہ بدستور زندہ رہتی اور مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے لئے آگے بڑھتی ہے۔ انسانی زندگی کا مقصد ذات کی نشوونما ہے۔

قرآنی نظریۂ زندگی

میں یہ لکھ رہا ہوں اور اچھی طرح سمجھ رہا ہوں کہ اس سے تمہارے دل میں کیا خیالات پیدا ہوں گے۔ تم کہو گے کہ میں نے یہ کون سی نئی بات کہہ دی ہے۔ یہ تو وہی پرانی کہانی ہے جسے ہم مذہب والوں (مثلاً ہندوؤں اور عیسائیوں) کی زبانی سنتے چلے آرہے ہیں۔ یعنی یہ کہ انسانی زندگی کا مقصد "روحانی ترقی" ہے لیکن سلیم! یہ وہی بات نہیں۔ اس سے بالکل مختلف بات ہے۔ "مذہب والوں" کا عقیدہ یہ ہے کہ

مذہب والوں کی روحانی ترقی

(۱) انسانی جسم (بلکہ پوری کی پوری مادی دنیا) روحانی ترقی کے راستہ میں روک بن کر حائل ہے۔ جب تک اسے راستے سے نہ ہٹایا جائے روحانی ترقی حاصل نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا

(۲) روحانی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ انسان دنیا ترک کرے۔ آرزوؤں کا خاتمہ کرے۔ تمام مادی آسائشوں کو قابلِ مذمت قرار دے۔ ان سے نفرت کرے اور کنارہ کش ہوتا چلا جائے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ

(۳) انسان انفرادی زندگی بسر کرے۔ خلوت کدوں میں رہے اور اللہ سے لَو لگاتے ہوئے انسانوں سے قطع تعلق کرتا چلا جائے۔

لیکن قرآنِ کریم کی رُو سے انسانی ذات کی نشوونما کے لئے ضروری ہے کہ

(۱) انسان خارجی کائنات کی تمام قوتوں کو مسخر کرے اور ان کے ماحصل کو قوانینِ خداوندی کے مطابق، تمام

قرآن کی رُو سے ذات کی نشوونما

نوعِ انسان کی فلاح و بہبود کے لئے عام کرتا چلا جائے۔ یاد رکھو سلیم! جس طرح اُس انڈے میں کبھی بچہ پیدا نہیں ہو سکتا جس کا خول ثابت نہ رہے، اسی طرح انسانی ذات کی نشوونما نہیں ہو سکتی جب تک اس کی زندگی مادی لحاظ سے محکم اور مضبوط نہ ہو۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ

(ب) انسان اجتماعی زندگی بسر کرے یعنی ایسا معاشرہ قائم کرے جس میں ہر شخص کی جسمانی ضروریات بھی باسانی پوری ہوتی رہیں اور اسے اس کی ذات کی نشوونما کے پورے پورے مواقع اور اسباب و ذرائع بھی میسر ہوں۔

(ج) اس قسم کے معاشرے کو اسلامی مملکت کہتے ہیں۔ اسلامی مملکت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ تمام افرادِ مملکت کی بنیادی

اسلامی مملکت کا فریضہ

ضروریاتِ زندگی کے بہم پہنچانے اور انسانی ذات کی نشوونما کے لئے ضروری اسباب و ذرائع فراہم کرنے کی ذمہ دار ہو۔ ("ذمہ دار" کا لفظ قابلِ غور ہے) اسے بھی سمجھ لو کہ ذات کی نشوونما میں قلب و دماغ (HEAD AND HEART) کی تمام صلاحیتوں کی نشوونما آجاتی ہے۔ مثال کے طور پر خدا کی صفت علیم اور خبیر ہے۔ لہٰذا اس فرد کا جس کی ذات کی نشوونما ہو رہی ہو، علیم و خبیر (صاحبِ علم اور باخبر) ہونا لازمی ہے۔ اس کے لئے ذہنی نشوونما ضروری ہے۔ دوسری طرف خدا کی صفت ربوبیت اور رزاقیت ہے اس لئے جس فرد کی ذات کی نشوونما ہو رہی ہو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ دوسروں کی پرورش کا جذبہ اپنے اندر رکھے اور ان کے مفاد کو اپنے مفاد پر ترجیح دے۔ اسے تم "قلب" کی نشوونما کہہ سکتے ہو۔ اگرچہ اس میں قلب کا تصور (MIND) کے اُس تصور سے مختلف ہے جو آجکل مغرب میں رائج ہے۔ مملکت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ ایسا انتظام کرے جس سے ہر فردِ مملکت کی ان صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی چلی جائے اور اس طرح یہ معاشرہ صفاتِ خداوندی کا چلتا پھرتا نمونہ بن جائے۔

مملکت مقصود بالذات نہیں

اس سے تم نے دیکھ لیا ہوگا سلیم! کہ قرآن کی رُو سے مملکت کا قیام مقصود بالذات نہیں۔ "مقصود بالذات" کے معنی ہیں (END IN ITSELF) یہ ایک مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے اور وہ مقصد ہے افراد کی ذات کی نشوونما جو اپنی آزاد مملکت کے بغیر ہو نہیں سکتی۔ لہٰذا اسلامی مملکت کے قیام (ESTABLISHMENT) بلکہ اس کی ہستی (EXISTENCE) کا جواز (JUSTIFICATION) یہ ہے کہ وہ افرادِ مملکت کی ذات کی نشوونما (جس میں جسمانی نشوونما سب سے پہلے آتی ہے) کی ذمہ دار ہے۔ جو مملکت اس مقصد کو پورا نہیں کرتی وہ اسلامی نہیں کہلا سکتی۔

فرد اور معاشرہ کا تعلق

اس مقام پر لازماً تمہارے دل میں یہ خیال پیدا ہوگا کہ میں نے اس وقت تک جو کچھ کہا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ قرآنی نظام میں ساری ذمہ داری مملکت کی قرار پاتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس میں افراد کو بھی کچھ کرنا پڑتا ہے یا نہیں؟ یہ سوال اہم ہے۔ حقیقت یہ ہے سلیم! کہ اگر تم انسان کی تمدنی زندگی

کی تاریخ پر نظر ڈالو تو یہ حقیقت تمہارے سامنے آئے گی کہ انسان کے سامنے شروع سے آج تک مسئلہ ہی ایک رہا ہے یعنی یہ کہ فرد اور معاشرہ (سوسائٹی۔ مملکت) کا باہمی تعلق کیا ہے؟ انسان نے جتنے نظام وضع کئے ہیں ان میں صورت یہ رہی ہے کہ جب سوسائٹی یا مملکت کو اہمیت دی گئی تو اس میں افراد کی انفرادیت (INDIVIDUALITY) ختم ہو گئی اور جب افراد کی انفرادیت برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی تو ان کے اجتماعی نظام میں انتشار واقع ہو گیا۔ قرآن نے ایک ایسا نظام دیا ہے جس میں افراد کی انفرادیت بھی دن بدن بلند سے بلند تر ہوتی جاتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ان کا نظم اجتماعی بھی محکم سے محکم تر ہوتا جاتا ہے۔ اس نظام کا راز پوشیدہ ہے فرد اور معاشرہ کے اس تعلق میں جسے قرآن نے واضح طور پر متعین کیا ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ میں اس "تعلق" کی وضاحت کروں، دو ایک باتیں بطور تمہید بیان کرنی ضروری ہیں۔

مشکل یہ ہے سلیم! کہ بات تم نے ایسی پوچھی ہے جس کے جواب میں اسلام کا سارا نقشہ تمہارے سامنے آجانا چاہیئے۔ اس کے بغیر بات واضح نہیں ہو سکتی۔ اور تقاضا تمہارا یہ ہے کہ میں کسی بنیادی نکتہ کے متعلق بھی یہ نہ کہوں کہ اس کی بابت میں تمہیں پہلے بتا چکا ہوں۔ اس لئے مجھے اس قدر تفاصیل میں جانا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ورنہ سوچو اور جواب دو کہ ان میں سے کونسی بات ایسی ہے جسے میں تمہیں اس سے پہلے بالواسطہ یا بلاواسطہ نہیں بتا چکا۔

اطاعت صرف خدا کی ہو سکتی ہے

اب سنو وہ تمہید۔ قرآن نے کھلے کھلے الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ کسی فرد، معاشرہ یا مملکت کو حق حاصل نہیں کہ وہ کسی انسان سے اپنی اطاعت کرائے۔ اطاعت صرف خدا کی ہو سکتی ہے۔

لیکن خدا نہ تو ہمارے سامنے آتا ہے۔ نہ کبھی ہم نے اس کی آواز سنی ہے۔ اس لئے اس کی اطاعت کس طرح کی جائے؟ اس کی اطاعت کی جاتی ہے ان قوانین کی رُو سے جو اس نے بذریعہ وحی دیئے ہیں۔

لیکن قوانین کی اطاعت انفرادی طور پر نہیں ہو سکتی۔ اس کے لئے اجتماعی نظام کی ضرورت ہے۔ جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے یہ اجتماعی نظام، اسلامی مملکت کہلاتا ہے۔ لہٰذا خدا کی اطاعت سے عملاً مفہوم ہے اس مملکت کی اطاعت جو قوانین خداوندی کو نافذ کرے۔

لیکن اس مملکت سے خدا یہ کہتا ہے کہ جب تم میرے نام پر انسانوں سے اطاعت لیتے ہو تو میں نے انسانوں کے

مملکت خدائی ذمہ داریاں پوری کرے گی

سلسلہ میں جو ذمہ داریاں اپنے اوپر لے رکھی ہیں تمہیں ان کو بھی پورا کرنا ہوگا۔ اگر تم خدائی ذمہ داریوں کو پورا نہیں کر سکتے تو تمہیں اس کا حق حاصل نہیں کہ تم میرے نام پر انسانوں کی اطاعت لو۔ اطاعت لینا اور ذمہ داریوں کو پورا کرنا ساتھ ساتھ چلے گا۔ لہٰذا قرآنی نظام میں فرد اور مملکت کے باہمی تعلق کی کیفیت یہ ہے کہ فرد مملکت کی وساطت سے قوانین خداوندی

کی اطاعت کرتا ہے اور مملکت ان تمام وعدوں کو پورا کرتی ہے جو خدا نے افراد سے کر رکھے ہیں۔ فرد اور مملکت کا یہ تعلق ایک معاہدہ کی رُو سے قائم ہوتا ہے جسے قرآن نے سورۂ توبہ میں مختصر لیکن جامع الفاظ میں بیان کیا ہے۔ ارشاد ہے اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ (۹/۱۱۱)۔ اس کا لفظی ترجمہ یہ ہے۔ "یقیناً اللہ نے مومنین سے ان کی جانیں اور مال خرید لئے ہیں تاکہ وہ انھیں جنت دیدے"۔ ان تصریحات کی روشنی میں جو اوپر بیان کی جا چکی ہیں اس کا مفہوم واضح ہے۔ عملی دنیا میں افرادِ معاشرہ اپنی جانیں اور مال اُس اسلامی مملکت کے سپرد کر دیتے ہیں جو نظامِ خداوندی کے قیام کی ضامن ہوتی ہے اور اس کے بدلے میں یہ مملکت انھیں "جنت" عطا کر دیتی ہے۔ یہ تمہیں معلوم ہی ہے سلیم! کہ ایک جنت وہ ہے جو انسان کو مرنے کے بعد ملے گی۔ لیکن قرآن اِس دنیا میں اسلامی معاشرہ کو بھی جنت سے تعبیر کرتا ہے اور اس کی خصوصیت یہ بتاتا ہے کہ اس میں انسانی جسم کی پرورش اور ذات کی نشوونما کے لئے تمام سامان اور ذرائع فراواں سے موجود ہوتے ہیں۔

افراد اور مملکت میں معاہدہ

لہٰذا مذکورہ صدر معاہدہ کی رُو سے، فرد اپنی جان اور مال، قوانین خداوندی کی اطاعت کے لئے اسلامی مملکت کے سپرد کر دیتا ہے اور مملکت اس کی جملہ بنیادی ضروریاتِ زندگی اور اس کی ذات کی نشوونما کے اسباب و ذرائع بہم پہنچانے کی ذمہ دار بن جاتی ہے۔ اس طرح فرد، اپنی جان اور مال معاشرہ کے حوالے کر دینے کے باوجود اپنی انفرادیت (ذات) قائم رکھتا ہے (بلکہ وہ نشوونما پاکر مستحکم سے مستحکم تر ہوتی چلی جاتی ہے)۔ اور مملکت کا نظام محکم بنیادوں پر استوار رہتا ہے۔

یہ بھی ظاہر ہے سلیم! کہ مملکت اپنی اس عظیم ذمہ داری کو سرانجام دے نہیں سکتی جب تک رزق کے سرچشمے اور وسائلِ پیداوار اس کی تحویل میں نہ ہوں۔ ویسے بھی جب افراد اپنی جان اور مال (سب کچھ) مملکت کے سپرد کر دیں تو وسائل پیداوار پر انفرادی ملکیت کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ افراد کی ضروریات کی ذمہ دار مملکت ہوتی ہے اور اس کے لئے وسائل پیداوار اس کی تحویل میں رہتے ہیں۔

رزق کے سرچشمے

میں یہ اوپر لکھ چکا ہوں کہ جس طرح انسانی جسم کی پرورش کے لئے (طبیعی) قوانین (PHYSICAL LAWS) مقرر ہیں اسی طرح انسانی ذات کی نشوونما کے لئے بھی قوانین متعین ہیں۔ ان قوانین کو قرآن "کلمات اللہ" کہہ کر پکارتا ہے اور ان کی خصوصیت یہ بتاتا ہے کہ وہ غیر متبدل ہیں۔ یعنی ان میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا (تم پہلے دیکھ چکے ہو کہ قرآن نے آئیڈیالوجی کے لئے "کلمہ" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ "کلمات" اس کی جمع ہے۔ لہٰذا کلمات اللہ وہ تصورات حیات ہیں جن کے مجموعہ کا نام اسلامک آئیڈیالوجی ہے۔ یہ تصورات غیر متبدل ہیں) سورۂ انعام میں ہے وَتَمَّتْ کَلِمَتُ رَبِّکَ صِدْقًا وَّعَدْلًا۔ لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِہٖ (۶/۱۱۵)

غیر متبدل اصول

تیرے رب کی طرف سے عطا کردہ نظریۂ زندگی یا تصورِ حیات صداقت اور عدل کے ساتھ مکمل ہو گیا۔ ان تصورات میں کوئی تبدیلی کرنے والا نہیں" یعنی اسلامک آئیڈیالوجی (تصورِ حیات) مکمل بھی ہے اور ناقابلِ تغیر و تبدل بھی۔ انہی تصورات کو غیر متبدل اصول (INVIOLABLE PRINCIPLES) یا مستقل اقدار (PERMANENT VALUES) کہتے ہیں۔ انسانی ذات کی نشوونما انہی اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے سے ہوتی ہے۔

جب اسلامی مملکت، افراد کی ذات کی نشوونما کے لئے سامان و ذرائع بہم پہنچانے کی ذمہ دار ہے تو اس سے لامحالہ مطلب یہ ہے کہ اس مملکت کا سارا کاروبار (خدا کی طرف سے عطا کردہ) مستقل اقدار (یا غیر متبدل اصولوں) کے مطابق سرانجام پائے گا۔ یہ ہوئی پہلی بات۔

اب دوسری بات سنو۔ تم یہ دیکھ چکے ہو کہ جب کسی فرد کی ذات کی نشوونما ہوتی ہے تو اس میں (حدودِ بشری کے اندر) ان صفات کی نمود ہوتی چلی جاتی ہے جنہیں (لامحدود انداز میں) صفاتِ خداوندی کہا جاتا ہے۔ یعنی ذاتِ خداوندی میں یہ صفات لامحدود انداز میں ہوتی ہیں اور انسانی ذات میں ان صفات کی نمود محدود طور پر ہوتی ہے۔ اگر یہ معلوم کرنا ہو کہ کسی فرد کی ذات کی نشوونما ہو رہی ہے یا نہیں تو دیکھنا یہ چاہیئے کہ اس میں وہ صفات پیدا ہو رہی ہیں یا نہیں جنہیں صفاتِ خداوندی کہا جاتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جب ایک فرد میں، جو مستقل اقدار کے مطابق زندگی بسر کرے صفاتِ خداوندی کی نمود ہوتی چلی جاتی ہے۔ تو جو مملکت ان اقدار کے مطابق قائم ہو گی اور انہی کے مطابق چلے گی اس

مملکت صفاتِ خداوندی کی مظہر

میں صفاتِ خداوندی کی نمود اور بھی شدت اور عظمت کے ساتھ ہو گی۔ لہٰذا اسلامی مملکت کی خصوصیت (اور پہچان) یہ ہے کہ وہ (بشری معاشرہ کی حدود کے اندر) صفاتِ خداوندی کی مظہر ہوتی ہے۔

ان دونوں باتوں کو یکجا کرنے سے نتیجہ یہ نکلا کہ

(۱) اسلامی مملکت کا نظم و نسق مستقل اقدار کے مطابق ہوتا ہے۔ اور

(۲) وہ مملکت صفاتِ خداوندی کی مظہر (اور خدائی ذمہ داریوں کے پورا کرنے کی ضامن) ہوتی ہے۔

قرآن نے مستقل اقدار اور صفاتِ خداوندی کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس لئے یہ معلوم کرنے کے لئے کوئی دقت نہیں ہو سکتی کہ فلاں مملکت اسلامی ہے یا نہیں۔ لہٰذا سمٹ سمٹا کر بات یوں سامنے آئی کہ

خلاصۂ مبحث

(ا) اسلامک آئیڈیالوجی ان مستقل اقدار (یا غیر متبدل اصولوں) کا نام ہے جو قرآنِ کریم میں مذکور ہیں۔

(ب) اسلامی مملکت انہی اقدار کے عملی نفاذ کے لئے قائم ہوتی ہے۔

(ج) اس مملکت کا اولین فریضہ یہ ہے کہ وہ افرادِ مملکت کی جسمانی پرورش اور ذات کی نشوونما کے سامان و ذرائع فراہم کرے۔ اور

(د) اس کی پہچان یہ ہے کہ وہ اِن صفاتِ خداوندی کی مظہر ہو جن کی تفصیل قرآن میں بیان ہوئی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ تمہارے دل میں بار بار یہ خیال انگڑائیاں لے رہا ہوگا کہ وہ مستقل اقدار کیا ہیں جن سے اسلامک آئیڈیالوجی ترتیب پاتی ہے۔ اور جن کی بنیادوں پر اسلامی مملکت کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ یہ سوال تمہارے دل میں پیدا بھی ہونا چاہیئے، اس لئے کہ جب تک یہ (مستقل) اقدار سامنے نہ آئیں نہ اسلامک آئیڈیالوجی سمجھ میں آسکتی ہے اور نہ اسلامی مملکت کا صحیح تصور قائم ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ اقدار تو سارے قرآن میں پھیلی ہوئی ہیں۔ انھیں ایک خط میں کس طرح سمویا جاسکتا ہے۔ (ان کی تفصیل میں نے اپنی اُس کتاب میں دی ہے جو آجکل زیرِ ترتیب ہے اور جس کا عنوان ہے ـــــ اسلام کیا ہے؟ ـــــ تمہیں اس کی اشاعت کا انتظار کرنا ہوگا)

لیکن میں جانتا ہوں کہ تم اتنا انتظار نہیں کرسکو گے اور دامن پکڑ کر بیٹھ جاؤ گے کہ چچا جان! ساری نہیں تو چند ایک اقدار ہی بتا دیجئے اور یہ اس لئے کہ تمہیں اس بات کا یقین ہے کہ میں تمہارے تقاضوں کو رد نہیں کرسکتا ـــــ ہاں سلیم! میں کسی ایسے متلاشیٔ حقیقت کے تقاضوں کو رَد نہیں کرسکتا مَنْ اَتَی اللّٰہَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ (۲۶/۸۹) جو اللہ کی طرف قلبِ سلیم لے کر آئے ـــــ اس لئے ان اقدار میں سے چند ایک (تمثیلاً) لکھے دیتا ہوں۔ غور سے سنو۔

چند ایک مستقل اقدار کا تعارف

پہلی قدر ـــــ احترامِ آدمیت

یہ تم دیکھ چکے ہو کہ ہر انسانی بچّے کو خدا کی طرف سے وہ شے (پیدائش کے ساتھ) ملتی ہے جسے انسانی ذات کہا جاتا ہے اور یہی چیز انسان کو حیوانات سے ممتاز کرتی ہے۔ اس لئے سب سے پہلی مستقل قدر یہ ہے کہ

ہر انسانی بچہ، محض انسانی بچہ ہونے کی جہت سے قابلِ عزت ہے

قرآن کا ارشاد ہے وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ (۱۷/۷۰) "یقیناً ہم نے ہر فرزندِ آدم کو واجب التکریم بنایا ہے"۔ اس میں کالے گورے۔ سید پٹھان۔ امیر غریب۔ مسلم غیر مسلم کی کوئی تفریق نہیں۔ ہر ابنِ آدم، محض آدمی کا بچہ ہونے کی جہت سے واجب التکریم ہے۔ یہی وہ بنیاد ہے جس پر انسانی مساوات کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے۔

لیکن اس مقام پر یہ سمجھ لینا بھی نہایت ضروری ہے کہ "انسانی مساوات" کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ اس لئے کہ (وہ ممالک تو ایک طرف رہے جن میں آمریت یا ڈکٹیٹرشپ کا دور دورہ ہے، جن اقوام میں جمہوری نظام رائج ہے وہاں بھی) مساوات کا مطلب اتنا ہی سمجھا جاتا ہے کہ مملکت کے ہر فرد کو حقِ رائے دہندگی دیدیا جائے۔ جس مساوات کی عمارت انسانی ذات کے عقیدہ پر استوار ہوتی ہے۔ اس کا مفہوم اس سے کہیں وسیع اور بلند ہے۔ ذات (PERSONALITY) کی بنیادی خصوصیات (BASIC CHARACTERISTICS) میں یہ بھی ہے

کہ کوئی ذات کسی دوسری ذات کے مقصد کے حصول کے لئے آلۂ کار (INSTRUMENT) نہیں بن سکتی۔ اس کے

حقیقی آزادی

معنی یہ ہیں کہ کوئی فرد اپنے مفاد کے حصول کے لئے کسی دوسرے فرد کو بطور ذریعہ استعمال نہیں کر سکتا۔ سلیم! یہ بات تو بظاہر چھوٹی سی ہے لیکن تم جوں جوں اس پر غور کرتے جاؤ گے یہ حقیقت نمایاں سے نمایاں تر ہوتی چلی جائے گی کہ انسان کی حقیقی آزادی کا راز اسی چھوٹی سی بات کے اندر پوشیدہ ہے۔ جس معاشرہ میں ہر فرد کو اس کا حتمی یقین اور کلی اطمینان ہو کہ اسے کوئی دوسرا فرد اپنے مقصد کے حصول کے لئے بطور ذریعہ استعمال نہیں کر سکتا اُس معاشرہ میں آزادی کی جو فضا پیدا ہو سکتی ہے اس کا آج تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

لیکن تم یہ کہو گے کہ اس طرح دنیا کے کام کیسے چل سکتے ہیں۔ تمدنی زندگی کے تو معنی ہی یہ ہیں کہ ایک کام کو مختلف لوگ مل کر کریں۔ یہ ٹھیک ہے۔ اور خود قرآن بطور مستقل قدر اس کی تاکید کرتا ہے جب کہتا ہے کہ تَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی (۵/۲)۔ زندگی کی کشادگی کی راہوں میں

دوسری قدر۔ تعاون

اور قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کے معاملات میں ایک دوسرے کی مدد کرو۔ لیکن اس میں اور جو بات میں کہہ رہا تھا اس میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اس میں تعاون کا حکم ہے؛ اور تعاون کے معنی ہیں ایک دوسرے کی مدد کرنا۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ مقصد اجتماعی ہو جو سب کو نوعِ انسانی کی منفعت اور بھلائی کی طرف لے جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے، تمام افراد، تقسیم کار کے اصول کے مطابق ایک دوسرے کی مدد کریں۔ یہ ہے "بر اور تقویٰ کے کاموں میں باہمی تعاون"۔ اس کے برعکس، جو بات میں کہہ رہا تھا وہ یہ تھی کہ ایک فرد اپنے ذاتی اور انفرادی مفاد کے حصول کے لئے، دوسرے انسانوں کو اس طرح استعمال کرے جس طرح مادی اسباب و ذرائع (مثلاً مشینوں کو) یا حیوانات کو استعمال کیا جاتا ہے۔ جب ہم گھوڑے کو تانگے میں جوتتے اور اسے اسٹیشن لے جاتے ہیں تو اس میں گھوڑے کا اپنا کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ مقصد صرف ہمارا ہوتا ہے۔ وہ ہمارے مقصد کے حصول کا ذریعہ ہوتا ہے۔ جب انسانوں کو اس طرح استعمال کیا جائے تو وہ انسان نہیں رہتے، مشینوں یا حیوانوں کی سطح پر آ جاتے ہیں۔ جن میں ذات (PERSONALITY) نہیں ہوتی۔ یہ انسانی ذات کا انکار اور انسانیت کی تذلیل ہے۔ اس سے فرزندِ آدم واجب التکریم نہیں رہتا۔ ایسا کرنے میں ہم قرآن کی ایک مستقل قدر کا انکار کرتے ہیں۔ اور قرآن کی کسی مستقل قدر کا انکار کفر ہے۔

تم جانتے ہو سلیم! کہ ایک انسان حیوانوں کی طرح دوسرے انسانوں کے مفاد کے حصول کا ذریعہ کیوں بنتا ہے؟ اس کا جواب بالکل واضح اور بیّن ہے۔ اسے احتیاج ایسا کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ ایک قلی گالیاں کھا کر بھی کام کئے

احتیاج!

جاتا ہے اس لئے کہ اسے معلوم ہے کہ اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو وہ بھوکا مر جائے گا۔ یہ بھوک کا خوف

(یا احتیاج) ہے جو ایک انسان کو دوسرے انسان کے مفاد کے حصول کا ذریعہ بننے پر مجبور کرتا ہے۔ غلط معاشرے میں ایسے حالات پیدا کر دیئے جاتے ہیں اور ان حالات کو مستقلاً قائم رکھا جاتا ہے، جن میں بعض افراد، اپنی روٹی (یعنی بنیادی ضروریاتِ زندگی) کے لئے دوسرے افراد کے دستِ نگر رہیں۔ اس سے وہ، ان افراد کے مفاد کا ذریعہ INSTRUMENT بننے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ لیکن قرآنی معاشرہ میں کوئی فرد اپنی ضروریات کے لئے کسی دوسرے فرد کا محتاج نہیں ہوتا۔ معاشرہ تمام افراد کی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانے کی ذمہ داری اپنے سر پر لیتا ہے اور اس طرح اس بنیادی علت کو جڑ سے کاٹ دیتا ہے۔ جو انسانی ذات کے عملی انکار کا موجب اور فرد کی تذلیل کا باعث بنتی ہے۔ یوں اس معاشرہ میں اُس مستقل قدر پر عمل ہوتا ہے کہ "ہر ابنِ آدم، محض انسان ہونے کی جہت سے واجب التکریم ہے"۔

اس مقام پر تم کہہ دو گے کہ مختلف انسانوں میں قابلیت اور صلاحیت میں فرق ہوتا ہے۔ اس لئے ان کے کمانے کی استعداد بھی مختلف ہوتی ہے۔ ایک شخص زیادہ کمانے کی اہلیت رکھتا ہے۔ دوسرا کم کمانے کی۔ اس طرح بعض افراد کو دوسروں کا دستِ نگر ہونا پڑتا ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ مختلف افراد میں کمانے کی استعداد میں فرق ہوتا ہے اور اس سے وہ تمام خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے لیکن قرآن کریم انسانی ذات کی مستقل قدر پر ایمان سے، ان مفاسد کا بھی صحیح صحیح علاج کر دیتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ انسانی جسم کی پرورش اس سے ہوتی ہے جسے وہ شخص اپنے آپ پر صرف کرے۔ لیکن، اس کے برعکس، انسانی ذات کی نشوونما اس سے ہوتی ہے جسے وہ فرد، دیگر افرادِ انسانیہ کی پرورش کے لئے عام کر دے۔ لہٰذا جن افراد میں کمانے کی زیادہ صلاحیت ہو، ان کا یہ بھی ایمان ہوتا ہے کہ وہ اپنی محنت کی کمائی سے جس قدر دوسروں کی نشوونما کے لئے دے دیں گے، اتنی ہی ان کی اپنی ذات کی نشوونما ہو گی۔ اور چونکہ ذات کی نشوونما زندگی کا مقصود ہے، اس لئے وہ اپنی کمائی میں سے اپنے لئے صرف بقدرِ ضرورت رکھیں گے باقی سب کچھ دیگر افراد کی پرورش کے لئے کھلا رکھیں گے۔ قرآن کی اصطلاح میں اسے "انفاق فی سبیل اللہ" کہتے ہیں، جو ایک مستقل قدر کی حیثیت رکھتا ہے۔

انفاق — تیسری مستقل قدر

تم پوچھو گے کہ وہ کون لوگ ہیں جن کی نشوونما کے لئے "انفاق" کی ضرورت پڑتی ہے؟ ان میں سے ایک طبقہ تو ان لوگوں کا ہے جو کسی حادثہ کی وجہ سے (خواہ وہ پیدائشی ہو یا بعد میں واقع ہو گیا ہو) کمانے کی استعداد سے محروم ہو جاتے ہیں۔ یہ وہ طبقہ ہے جس کی پرورش (دنیا کے موجودہ غیر قرآنی معاشرہ میں) امیروں کی خیرات سے ہوتی ہے۔ لیکن خیرات سے انسانی ذات کی جس قدر ذلت ہوتی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اس لئے ان کی پرورش کا یہ انتظام قرآن کے نزدیک ایک مستقل نظام کی حیثیت سے کبھی قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ وہ اسے ہنگامی حالات میں تو برداشت کر سکتا ہے لیکن اسے معمولِ حیات نہیں بنا سکتا۔ (اس اصول کو یاد رکھو سلیم! کہ جس بات سے انسانی ذات کی کسی طرح بھی تذلیل یا تحقیر ہو، قرآن اسے روا نہیں رکھتا)۔ اس طبقہ کے متعلق (جو کمانے کی استعداد سے محروم ہو چکے ہوں) اس نے کہا ہے

کہ وہ لوگ اپنے لئے سامانِ نشوونما بطور حق (AS OF RIGHT) طلب کر سکتے ہیں (حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ — ۷۰/۲۵) یہ بھی قرآن کی ایک مستقل قدر ہے۔ جسے کسی صورت میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

چوتھی قدر — محروم کا حق

دوسرا طبقہ وہ ہے جن کی کمائی ان کی ضروریات کے لئے کافی نہیں ہو سکتی۔ ایک مزدور مہینہ بھر کی محنت شاقہ سے ساٹھ روپے کماتا ہے لیکن اس کے بیوی بچوں کی بنیادی ضروریات سو روپے مہینے سے کم میں پوری نہیں ہوتیں۔ یہ مزدور بقایا چالیس روپے کہاں سے لائے۔ غیر قرآنی معاشرہ کو اس سے کچھ واسطہ نہیں ہوتا۔ یہ اس کا اپنا معاملہ ہے جس سے وہ جس طرح جی چاہے نپٹے۔ وہ مرے۔ وہ جئے۔ اس سے کسی دوسرے کو سروکار ہی نہیں ہوتا۔ قرآن نے اس باب میں ایسی مستقل اقدار دی ہیں جو اس مسئلہ کا نہایت اطمینان بخش حل پیش کر دیتی ہیں۔ اس نے کہا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ (۱۶/۹۰) "اللہ عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے"۔ عدل کے معنی ہیں برابر سرابر کر دینا۔ جو کچھ کسی کا واجب ہے وہ دیدینا۔ اس سے ظلم کی روک تھام ہو گئی۔ (ظلم کے معنی ہیں کسی کے حقوق میں کمی کرنا۔) اور احسان کے معنی ہیں کسی کی کمی کو پورا کر کے اس کے بگڑے ہوئے توازن کو برقرار کر دینا۔ اس سے ان لوگوں کی نشوونما ہوتی چلی جاتی ہے جن کی محنت کی کمائی ان کی ضروریات کے لئے کفایت نہ ہو۔ یہ دونوں (یعنی عدل اور احسان) مستقل اقدار ہیں جنہیں کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اور جن کا برقرار رکھنا قرآنی معاشرہ یا اسلامی مملکت کا فریضہ ہے۔

عدل و احسان۔ بطور مستقل اقدار

تم نے دیکھا سلیم! قرآن کس طرح "انفاق فی سبیل اللہ" کی مستقل قدر سے انسانی مساوات کو عملاً متشکل کرتا اور انسانی ذات کی صحیح تکریم کی ضمانت بہم پہنچاتا ہے۔ یعنی

(۱) جو لوگ اپنی ضروریات سے زیادہ کما سکیں ان کے لئے مستقل قدر یہ ہے کہ جو کچھ ان کی ضروریات سے زائد ہو، وہ اسے دوسروں کی نشوونما کے لئے کھلا رکھیں ——— سورۂ بقرہ میں ہے یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ۔ قُلِ الْعَفْوَ (۲/۲۱۹) "تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر دوسروں کے لئے کھلا رکھیں۔ ان سے کہدو کہ جس قدر تمہاری ضروریات سے زیادہ ہے، سب کا سب۔

(۲) جو لوگ محنت سے معذور ہو چکے ہوں، وہ دوسروں کی فاضل دولت میں ان کا حق قرار دیتا ہے اور اسے بطور مستقل قدر پیش کرتا ہے۔

(۳) جو محنت کریں ان کی محنت کا پورا پورا معاوضہ دینا بھی مستقل قدر کی حیثیت رکھتا ہے اور

(۴) جن کی کمائی ان کی ضروریات کے لئے کافی نہ ہو سکتی ہو، ان کی کمی کا پورا کرنا بھی مستقل قدر ہے۔

اب سلیم! ایک اور گوشے کو لو۔ جب انسانی ذات کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کسی دوسرے فرد کے ذاتی مقصد کے حصول کا آلۂ کار نہ بنے۔ تو انسانی ذات کی تکریم کا فطری تقاضا یہ بھی ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے شخص پر حکومت نہ کر سکے۔ اس سے اپنا حکم نہ منوا سکے۔ قرآن نے اس اصول کو بھی ایک مستقل قدر کی حیثیت سے پیش کیا ہے جہاں کہا ہے کہ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ..... (۳/۷۹) کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ خدا سے ضابطہ قوانین، حکومت اور نبوت (تک بھی) عطا کر دے اور وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کی نہیں بلکہ میری محکومیت اختیار کرو۔" تم نے دیکھا سلیم! کہ اس ایک اصول نے کس طرح غلامی اور محکومی کی جڑیں کاٹ کر رکھ دیں؟

کوئی محکوم نہ ہو ــــ مستقل قدر

لیکن تم کہو گے کہ اگر کوئی شخص کسی دوسرے کا حکم ہی نہ مانے تو معاشرے میں نظم و ضبط کس طرح قائم رہے گا۔ اس طرح تو فساد (CHAOS) برپا ہو جائے گا۔ تمہارے اس اعتراض کا جواب اس آیت کے باقی ماندہ حصہ میں آجاتا ہے جو اوپر نقل کی گئی ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ۔ پوری آیت کا مطلب یہ ہے کہ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں سے یہ کہے کہ وہ اُس کی محکومی اختیار کریں۔ وہ یہی کہیگا کہ وہ اُس کتاب (کی اطاعت) سے جسے وہ پڑھتے پڑھاتے ہیں، ربّانی بن جائیں۔ بات بالکل واضح ہے۔ قرآن کی اس مستقل قدر کی رُو سے اطاعت کسی انسان کی نہیں ہو گی بلکہ قوانین خداوندی کی ہو گی جو اس نے اپنی کتاب میں عطا کر دیئے ہیں ــــ کسی فرد کی نہیں بلکہ قانون کی اطاعت ــــ اور قانون بھی ایسا نہیں جو کسی انسان کا وضع کردہ ہو، بلکہ وہ جو خود خدا نے نوعِ انسانی کی راہ نمائی کے لئے دیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے سلیم! کہ اسلامی مملکت میں اطاعت کسی انسان کے حکم کی نہیں ہو گی۔ صرف ان قوانین کی اطاعت ہو گی جو کتاب اللہ میں دیئے گئے ہیں۔

قانونِ خداوندی کی اطاعت۔ مستقل قدر

تم کہو گے کہ کتاب اللہ میں تو بیشتر مستقل اقدار یا غیر متبدل اصول ہی دیئے گئے ہیں۔ لیکن معاشرہ کا نظم و نسق تو اس صورت میں برقرار رہ سکتا ہے جب چھوٹی بڑی تمام باتوں کے لئے احکام و ضوابط موجود ہوں۔

تم ٹھیک کہتے ہو۔ یہ احکام و ضوابط قرآن کی مستقل اقدار کی روشنی میں خود مرتب کئے جائیں گے۔ سوال یہ ہے کہ یہ کیسے مرتب ہوں گے؟ اس کے لئے بھی قرآن نے ایک مستقل قدر دی ہے جب کہا ہے کہ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸) یہ چیزیں امت کے باہمی مشورہ سے طے ہوں گی۔ اس سے ظاہر ہے کہ اسلامی مملکت ایک ایسے مشاورتی نظام کا نام ہے۔ جس میں قرآن کے

مشاورت۔ مستقل قدر

غیر متبدل اصولوں کی چار دیواری میں رہتے ہوئے، ہر زمانہ کے مسلمان، جزئی احکام وضوابط، اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق باہمی مشورہ سے خود مرتب کریں گے۔ اس سے یہ بھی واضح ہے کہ اس نظام میں یہ صورت نہیں ہوگی کہ ارباب حکومت کا ایک طبقہ الگ ہو اور باقی اُمت ان کی محکوم ہو۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، اس میں حاکم اور محکوم کا فرق ہی نہیں ہوگا۔ اسلامی حکومت، اس لئے وجود میں آتی ہے کہ وہ قرآنی اقدار کا نفاذ کرے اور غیر قرآنی مسالک وضوابط کی ترویج کو روک دے۔ اسے قرآن کی اصطلاح میں "امر بالمعروف ونہی عن المنکر" کہتے ہیں۔ قرآن نے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے فریضہ کو تمام امت کا مشترکہ فریضہ قرار دیا ہے۔ نہ کہ کسی خاص طبقہ، پارٹی یا جماعت کا۔ اس نے پوری امت کو مخاطب کرکے کہا ہے کہ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ..... (۳/۱۱۰) "تم بہترین امت ہو جسے نوع انسانی کی بھلائی کے لئے متشکل کیا گیا ہے۔ تم معروف کا حکم دیتے ہو اور منکر سے روکتے ہو"۔ لہٰذا قرآن کی اس مستقل قدر کی رُو سے نظم ونسق مملکت میں پوری کی پوری قوم بالواسطہ یا بلاواسطہ شریک ہوتی ہے اور اس میں حاکم اور محکوم کے الگ الگ طبقات نہیں ہوتے۔

اس سے یہ بھی واضح ہے سلیم! کہ جب پوری امت کے لئے ایک ضابطہ قوانین دیا گیا ہے اور اس ضابطہ کو

کوئی فرقہ یا پارٹی نہیں

نافذ کرنے کا فریضہ پوری کی پوری امت کی مشترکہ ذمہ داری قرار دیا ہے، تو امت میں فرقوں یا پارٹیوں کے وجود کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے فرقہ بندی کو شرک قرار دیا ہے۔ اس نے مسلمانوں سے واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ. مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا. كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ (۳۰/۳۱) "دیکھنا! کہیں تم نے مشرک نہ ہو جانا۔ یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں فرقے پیدا کر لئے اور گروہوں میں بٹ گئے۔ پھر کیفیت یہ ہو گئی کہ ہر گروہ اپنے اپنے مسلک میں مگن ہو کر بیٹھ گیا"۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کا منتہیٰ وحدت

نوعِ انسان ایک امت

قانون کی بنیاد پر، تمام نوع انسانی کو ایک عالمگیر برادری بنانا ہے۔ اس کا ارشاد ہے کہ كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً (۲/۲۱۳) "تمام نوعِ انسانی ایک قوم ہے"۔ اور یہ بھی ایک مستقل قدر ہے۔ سو، جو نظام تمام انسانوں کو ایک برادری کے قالب میں ڈھالنے کا پروگرام اپنے سامنے رکھتا ہو، وہ خود اپنے اندر فرقوں اور پارٹیوں کو کیسے برداشت کر سکتا ہے؟ اس کے نزدیک انسان کی تقسیم کا معیار ایک ہی ہے۔ یعنی کفر اور ایمان۔ هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَمِنْكُمْ مُؤْمِنٌ (۶۴/۲) اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ قرآن کی مستقل اقدار کی صداقت پر یقین رکھیں اور اس کے مطابق اپنا معاشرہ متشکل کر لیں، وہ ایک قوم کے

معیارِ قومیت ۔ مستقل قدر

افراد۔ اور جو اس کے خلاف، انسانوں کے خود ساختہ قوانین کے مطابق زندگی بسر کریں، وہ دوسری قوم کے افراد۔ قومیت کا یہ معیار بھی ایک مستقل قدر

کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور قرآن کے دوسرے اصولوں کی طرح غیر متبدل ہے اور جب قرآن کی رُو سے تمام مسلمان ایک قوم کے فرد ہیں تو وہ امت میں فرقوں اور پارٹیوں کے وجود کو کس طرح تسلیم کر سکتا ہے؟ قرآنی نظام وحدتِ قانون اور وحدتِ امت کی بنیادوں پر متشکل ہوتا ہے۔

میں نے جو اوپر کہا ہے کہ قرآن کی رُو سے معیارِ قومیت یہ ہے کہ جو لوگ قرآن کی متعین کردہ مستقل اقدار کو اپنا نصب العین حیات قرار دے لیں وہ ایک قوم کے فرد۔ اور جو اس سے انکار کریں وہ دوسری قوم کے افراد ـــــ تو اس سے تم نے یہ نہ سمجھ لینا کہ جس طرح آج ہر قوم اپنے اپنے مفاد کے تحفظ میں سرگرم تگ و تاز رہتی ہے اور اسے نہ صرف یہ کہ دوسری اقوام کے مفاد کا کوئی خیال نہیں ہوتا بلکہ اگر کسی دوسری قوم کا مفاد اُس کے مفاد سے ٹکرائے تو وہ اپنے فائدے کی خاطر دوسروں کے نقصان کی قطعاً پرواہ نہیں کرتی؛ اسی طرح قرآنی معاشرہ میں بھی ہوگا۔ قطعاً نہیں۔ قرآنی معاشرہ میں تمام لوگ "فرزندانِ آدم" تسلیم کئے جائیں گے اور ان تمام حقوق و مراعات کے مستحق ہوں گے جو مستقل اقدار کی رُو سے ہر فرزندِ آدم کو (بطور استحقاق) ملتی ہیں۔ قرآن اس باب میں یہاں تک کہتا ہے کہ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا ۚ اِعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ (۵/۸) "کسی قوم کی دشمنی بھی تمہیں اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم اس سے عدل نہ کرو۔ ہمیشہ عدل کرو کہ یہی چیز قرآنی طرزِ زندگی سے قریب ہے"۔

دشمن سے بھی عدل

عدل ہی نہیں۔ بلکہ یہ لوگ قرآنی نظام کی تمام نفع بخشیوں میں حصہ دار ہوں گے۔ اس لئے کہ قرآن کی ایک بنیادی مستقل قدر یہ بھی ہے کہ

تمام نوعِ انسانی کی نفع بخشی

مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ (۱۳/۱۷)

بقا اور دوام اسی کے لئے ہے جو تمام عالمِ انسانیت کے لئے نفع بخش ہے

"الناس" میں اپنے اور پرائے۔ مومن و کافر ـــــ سب شامل ہیں۔ قرآن کا خدا ـــــ رب العالمین ہے۔ اس کا رسول ـــــ رحمۃ للعالمین۔ اور خود قرآن ذکر للعالمین۔ اس لئے اسلامی مملکت کی نفع بخشیاں تمام نوعِ انسانی کے لئے ہیں۔

یہ ہے سلیم! اسلامی آئیڈیالوجی کا مختصر سا تعارف۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ

(ا) اسلامک آئیڈیالوجی ان مستقل اقدار یا غیر متبدل اصولوں کے مجموعہ کا نام ہے جو اپنی مکمل شکل میں قرآن کریم میں محفوظ ہیں۔

(ب) جب کوئی مملکت ان اقدار کو اپنا نصب العین قرار دے لے تو اسے اسلامی مملکت کہتے ہیں۔ اور

(ج) جو دستور اُس کے اس نصب العین کا اعلان کرے اور مملکت کی عمارت کو ان اقدار کی بنیادوں پر استوار کرنے کا

نقشہ مرتب کر کے دے اسے اسلامی آئین کہیں گے۔

(۲) اسلامی آئین کی عمارت اس بنیاد پر استوار ہوتی ہے کہ

(ا) انسان صرف اس کے طبیعی جسم سے عبارت نہیں۔ جسم کے علاوہ ایک اور شے بھی ہے جسے انسانی ذات کہتے ہیں۔

(ب) اسلامی مملکت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ تمام افراد معاشرہ کی جسم کی پرورش کے لئے طبیعی ضروریات کی ذمہ دار ہو اور ان کی ذات کے ارتقاء کے لئے ایسے سامان و ذرائع فراہم کرے جن سے ان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی جائے۔

(ج) اس عظیم ذمہ داری سے عہدہ برا ہونے کے لئے ضروری ہے کہ اسباب و ذرائع پیداوار مملکت کی تحویل میں رہیں۔

(۳) انسانی ذات کی نشوونما ان مستقل اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے سے ہوتی ہے جو قرآن کریم میں محفوظ ہیں۔ اس لئے اسلامی مملکت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ ان مستقل اقدار کے مطابق معاشرہ قائم کرے۔

(۴) مستقل اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے سے انسانی ذات میں صفات خداوندی کی (حد درجہ بشریت کے مطابق) نمود ہوتی چلی جاتی ہے۔ لہٰذا اسلامی مملکت میں افراد اور مملکت، دونوں صفات خداوندی کے مظہر ہوتے ہیں۔

(۵) مستقل اقدار کی رُو سے

(ا) ہر انسان بحیثیت انسان واجب التکریم ہے۔

(ب) کسی انسان کو حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ کسی دوسرے انسان سے اپنا حکم منوائے۔ اطاعت ہر ایک کو قوانین خداوندی کی کرنی ہوتی ہے جو قرآن میں مذکور ہیں۔

(ج) ہر فرد پوری پوری محنت کر کے کمائی کرتا ہے لیکن اس میں سے اپنے لئے صرف اپنی ضروریات کے مطابق رکھتا ہے۔ باقی سب کچھ دوسروں کی نشوونما کے لئے دیدیتا ہے کیونکہ ایسا کرنے سے اس کی اپنی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔

(د) ہر ایک سے عدل کیا جاتا ہے (حتیٰ کہ دشمن سے بھی)۔ اور جن افراد میں کسی وجہ سے کوئی کمی رہ جائے اس کمی کو پورا کر دیا جاتا ہے

(ہ) تمام نوع انسان کو ایک عالمگیر برادری سمجھا جاتا ہے اور اسلامی مملکت کے نظام ربوبیت میں ہر انسان کا برابر کا حصہ ہوتا ہے

(س) اسلامی مملکت مستقل اقدار کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے، اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق جزئی قوانین ملت کی مشاورت سے، خود مرتب کرتی ہے۔ ان جزئی قوانین میں حسب ضرورت تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ لیکن مستقل اقدار اپنی جگہ غیر متبدل رہتی ہیں۔ اس طرح، ثبات اور تغیر کے حسین امتزاج سے معاشرہ آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔

یہ ہیں سلیم! اسلامک آئیڈیالوجی کے نمایاں خط و خال۔ کہو! اب تو نہیں بھولو گے؟

اچھا خدا حافظ۔ والسلام

پرویز

اگست ۱۹۵۹ء

برقِ طور
پرویز
صفحات:- ۳۲۰
قیمت چھ روپے

بزموں کے نمائندوں کا اجتماع

۳ر اکتوبر —— بمقام راولپنڈی

سابقہ کونشن میں یہ فیصلہ ہوا تھا کہ اکتوبر ۱۹۵۹ء میں تمام بزموں کے نمائندوں کا اجتماع ہوگا جس میں قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے سلسلہ کو وسیع تر کرنے کی تجاویز پر غور و خوض کیا جائے گا۔ بزم راولپنڈی نے دعوت دی ہے کہ یہ اجتماع ان کے زیر اہتمام منعقد کیا جائے چنانچہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ

(۱) یہ اجتماع بروز ہفتہ، ۳ر اکتوبر، راولپنڈی میں منعقد ہوگا۔ ۲ر اکتوبر جمعہ کی شام تمام نمائندگان راولپنڈی پہنچ جائیں۔ محترم پرویز صاحب کا عام خطاب اسی شب کو ہوگا۔ ہفتہ کی صبح (بعد نماز فجر) اجتماع نمائندگان کی کارروائی شروع ہو کر شام تک ختم ہو جائے گی۔ شرکائے اجتماع، رات کو راولپنڈی ٹھہر کر، اتوار کی صبح، ناشتہ کے بعد، رخصت ہو جائیں گے۔

(۲) ہر ابتدائی بزم کے لئے لازمی ہوگا کہ وہ اپنے ہاں سے ایک نمائندہ اجتماع میں شرکت کے لئے بھیجے۔ اسی طرح، ہر ضلع بزم کے ترجمان بھی شریکِ اجتماع ہوں۔ اگر کوئی بزم ایک سے زیادہ نمائندہ بھیجنا چاہے، تو وہ اس کے متعلق بزم راولپنڈی سے قبل از وقت طے کر لے۔ کوئی صاحب بطور مبصر شریکِ اجتماع نہیں ہو سکیں گے۔

(۳) بزم راولپنڈی نے طے کیا ہے کہ ہر مہمان مبلغ پانچ روپے قیام و طعام کے اخراجات کے لئے ادا کرے۔ یہ رقم نمائندہ بزم راولپنڈی کے پاس ۱۵ر ستمبر تک جمع ہو جانی چاہیئے۔

(۴) مہمانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہلکا سا بستر ہمراہ لائیں۔ رات کو اوپر اوڑھنے کے لئے گرم چادر یا ہلکا سا کمبل کافی ہوگا۔

(۵) اجتماع میں شرکت کے متعلق جملہ خط و کتابت براہِ راست نمائندہ بزم راولپنڈی سے کی جائے۔ ادارہ طلوعِ اسلام سے نہ کی جائے۔

(۶) مقامِ اجتماع کا پتہ یہ ہے:۔ راولپنڈی شہر۔ مری روڈ۔ گورنمنٹ زنانہ کالج کے سامنے، ایک کچا سا راستہ اندر کی طرف جاتا ہے۔ اس پر چند قدم کے فاصلے پر "الکوثر" نام کا مکان ہے۔ اس میں اجتماع ہوگا۔ باہر سڑک پر "الکوثر" کا بورڈ بھی رکھ دیا جائے گا۔

جملہ خط و کتابت بنام

نمائندہ بزم طلوعِ اسلام

"الکوثر" متصل گورنمنٹ زنانہ کالج۔ مری روڈ

راولپنڈی

نیا ایڈیشن شائع ہوگیا

سلیم کے نام خطوط

حصہ اول

فہرست مشمولات

- ہماری نمازیں اور روزے کیوں بے نتیجہ رہتے ہیں
- ہمارے مذہبی اجتماعات
- ذات پات کی تمیز
- طلاق کا قرآنی مفہوم
- اسلامی نظام کے بنیادی اصول
- مغرب اور قرآنی تہذیب کا بنیادی فرق
- کیا انسانی زندگی محض آب دگل کا کھیل ہے؟
- کمیونزم اور اسلام
- کمیونزم اور اسلام (۲)
- قرآنی نظامِ ربوبیت
- تکذیبِ دین کون کرتا ہے؟
- صلوٰۃ وزکوٰۃ کا مفہوم
- کیریکٹر کیسے پیدا ہوتا ہے؟
- انسان کو اخلاقی ضوابط کا پابند کس طرح بنایا جاسکتا ہے؟
- اس دور میں دیانتدار بننا حماقت ہے
- عمل بلا معاوضہ
- غلامی سے بدتر ہے بے یقینی

صفحات:- ۴۳۳　　قیمت:- آٹھ روپے

(نوٹ) پیشگی خریداروں کو نیا ایڈیشن طلب کرنے پر ارسال کیا جائے گا۔

ملنے کا پتہ:

ناظمِ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ، لاہور

قرآن کے صحائف

قریب دس برس سے آپ اخبارات میں، وقتاً فوقتاً کچھ خبریں پڑھتے چلے آرہے ہوں گے جن کا عنوان ہوتا ہے۔

بحر میت کے مخطوطات۔ یعنی (SCROLLS OF DEAD SEA)

آپ شاید اسے ایک عام خبر کی حیثیت دے کر آگے بڑھ جاتے ہوں گے لیکن آپ یہ سنکر حیران ہونگے کہ ان مخطوطات کے گرد، علم و تحقیق کی ایک دنیا جمع ہے اور ان کی کوہ کنی اور جگر کاوی آج سے قریب دو ہزار برس پیشتر کے ایک مخصوص گوشے کو عجیب و غریب انداز سے ہر چشم بینا کے سامنے بے نقاب کئے جارہی ہے۔ یہ مخطوطات کہاں سے ملے، کیسے ملے۔ اب کہاں ہیں۔ ان میں کیا لکھا ہے۔ جو کچھ لکھا ہے اس سے کیا کیا حقائق سامنے آتے ہیں۔ یہ وہ سوال ہیں جن کے جوابات ہر اس شخص کے لئے جس کے دل میں علم و تحقیق کے لئے کچھ بھی تڑپ ہو، موجب صد دلچسپی ہوں گے۔

حلقۂ طلوع اسلام کے ایک قدیم رفیق ہیں ـــــ محترم لطیف الرحمٰن صاحب صدیقی ـــــ انھیں قرآنی فکر سے انتہائی شغف اور اس قسم کے علمی تحقیقاتی امور سے گہری دلچسپی ہے ان مخطوطات کے متعلق جو کچھ مختلف رسائل اور کتب میں شائع ہوتا ہے وہ اسے بڑے انہماک سے پڑھتے رہے ہیں اب انھوں نے اپنے اس مطالعہ کے حاصل کو ایک مقالہ کی شکل میں مرتب فرمایا ہے جو آئندہ صفحات میں آپ کے سامنے آرہا ہے۔ چونکہ یہ مقالہ مختلف مضامین سے حاصل کردہ معلومات پر مشتمل ہے اس لئے اس میں بعض مقامات پر تکرار نظر آئے گی۔ اور چونکہ صدیقی صاحب کی مقالہ نگاری کی یہ (غالباً) پہلی کوشش ہے۔ اس لئے اس میں ایک کہنہ مشق صحافی کی پختگی بھی دکھائی نہیں دے گی لیکن یہ معلومات اس قدر دلچسپ اور بصیرت افروز ہیں کہ ہم اس کے باوجود اسے بمسرت شائع

کر رہے ہیں۔ اس سے دو مقاصد پیشِ نظر ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس سے اُس فرقہ ایسینی (ESSENES) کے متعلق معلومات بہم پہنچتی ہیں جن میں حضرت عیسٰیؑ نے اپنی حیاتِ طیبہ کے ابتدائی ایام (قبل از بعثت) گذارے تھے اور جو جماعت اُس زمانے کے فکر و عمل پر بڑی اثر انداز تھی۔ اور دوسرے یہ کہ ہم اس سے یہ سبق حاصل کر سکیں کہ زندہ قومیں علمی تجسس و تحقیق کے سلسلے میں کیا کچھ کرتی ہیں اور جنھیں ہمارے ہاں "علماء" کہا جاتا ہے وہ کن مشاغل میں مصروف رہتے ہیں۔ اقبالؒ کے الفاظ میں

دینِ کافر، فکر و تدبیرِ جہاد
دینِ مُلّا، فی سبیل اللہ فساد

اب آپ محترم لطیف الرحمٰن صدیقی صاحب کا مقالہ ملاحظہ فرمایئے۔ [طلوعِ اسلام]

یروشلم میں عربی فلسطین کے آثارِ قدیمہ کے ایک مخفی کمرے میں کچھ علماء اور مبصرین دن رات ایک اہم اور پیچیدہ گتھی کو سلجھانے میں مصروف نظر آتے ہیں۔ انتہائی صبر اور ضبط کے ساتھ ہزاروں چھوٹے چھوٹے کاغذ اور لکڑی کے ٹکڑوں کو ملانے اور انھیں صحیح مقامات پر رکھنے میں لگے رہتے ہیں۔ اُن میں بعض ٹکڑے تو اس قدر چھوٹے ہیں جتنا ترشا ہوا ناخن کا ٹکڑا۔ بوسیدہ اور نازک اس قدر کہ برش کے بال کا ایک ہلکا سا جھٹکا ان کو ریزہ ریزہ کر سکتا ہے۔ یہ پرانے کاغذ اور چمڑے کے ٹکڑے آخر ہیں کیا اور ان کے جمع کرنے اور پڑھنے پر علماء کا اس قدر زور اور رجحان کیوں ہے۔

یہ ہیں اب سے دو ہزار سال پہلے کے پرانے صحائف یعنی حضرت موسٰیؑ کی توریت کے اوراقِ پریشان جن کو زمانۂ قدیم میں حضرت موسٰیؑ کے پیچھے پیچھے پیرؤوں نے جو کہ بعد کو ایسینی (ESSENES) کہلائے جمع کئے تھے۔ بحرِ مردہ (DEAD SEA) کے کنارے قمران[1] میں جو آجکل خرابۂ قمران کہلاتا ہے۔ ان لوگوں کا مرکز حضرت عیسٰیؑ کی پیدائش سے دو سو سال قبل قائم کیا گیا تھا۔ وہ مواد جو ان صحائف سے حاصل ہوا ہے اُس نے موجودہ دنیائے عیسائیت میں تہلکہ مچا دیا ہے۔ حقیقت پر جو صدیوں سے پردے پڑے ہوئے تھے ایک ایک کر کے اٹھتے چلے جا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ اصلی

---

[1] ایسینیوں نے اپنا مرکز قریباً دو سو سال قبل مسیح قمران میں ایک قدیم اسرائیلی بستی کے کھنڈرات پر جو کہ آٹھ سو سال قبل مسیح وہاں واقع تھی قائم کیا تھا۔ یہ مرکز ۲۰۰ گز لمبائی میں اور ۸۰ گز چوڑائی میں بنا ہوا تھا۔ آجکل یہ مرکز ماہرین آثارِ قدیمہ اور علماء کی خصوصی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ یہ لوگ مرکز کے اردگرد خیموں اور غاروں میں رہا کرتے تھے۔ قمران کی قدیمی تاریخ کو منظرِ عام پر لانے میں امریکی اور فرانسیسی علماء نے بڑا کام کیا ہے۔ قمران یروشلم اور بیت اللحم سے ۱۴ میل کے فاصلے پر ہے۔ قریب کے غاروں میں سے صحائف برآمد ہوئے ہیں۔ بحرِ مردہ میں ۲۵ فیصدی نمک ہے۔ قریب ہی عین فشخاہ کا چشمہ ہے جس سے تازہ پانی حاصل کیا جاتا ہے۔ یہ چشمہ قمران سے پانچ میل کے فاصلے پر ہے۔ اسکے اردگرد کے علاقہ کو کھیتی باڑی کے کام میں لایا جاتا تھا۔ ایک باغ بھی بنا ہوا تھا۔ ماہرین حضرات نے بدوؤں کی مدد سے گیارہ غار اور دریافت کئے ہیں۔ ان میں سے کھیتی باڑی کے ہتھیار اور اوزار ملے ہیں جنکو یہ لوگ کام میں لاتے تھے۔ اسکے علاوہ خرابۂ مرد میں بھی بہت سے صحائف ملے ہیں۔ یہ کھنڈرات بازنطینی خانقاہ کے ہیں۔

یہودیت اور عیسائیت کی تاریخ نمایاں اور نکھر کر سامنے آ رہی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پاپائے روم اور کٹر عیسائیت کے رہنماؤں کے پیروں تلے سے زمین کھسک رہی ہے اور تعجب در تعجب یہ ہے کہ قرآنی تعلیم کی تائید اور تصدیق ایسے ایسے گوشوں سے ہو رہی ہے جن کا تصور بھی اب سے چند سال قبل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ صنم خانوں سے کعبہ کو پاسبان ملتے چلے جا رہے ہیں۔

بحر مُردہ کے کنارے پائے ہوئے یہ صحائف عام طور پر (DEAD SEA SCROLLS) کے نام سے مشہور ہیں۔ یہ جیسے عجیب و غریب ہیں ویسے ہی عجیب و غریب انداز سے یا محض اتفاقی طور پر ہاتھ آ گئے ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں محمد ابن الذئب طامرہ قبیلہ کے بدوؤں سے تعلق رکھنے والا یہ نوجوان ایک دن اپنی کھوئی ہوئی بکری کی تلاش میں بحر مُردہ کے کنارے خشک اور بنجر ریگستان میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ اسی تلاش میں وہ بحر مُردہ کے شمال مغربی کنارے والی چھوٹی پہاڑیوں پر چڑھ گیا[1] اور سامنے والے غار میں ایک پتھر پھینک دیا۔ اس خیال سے کہ اگر وہاں پر بکری ہوئی تو باہر نکل آئے گی۔ لیکن وہ پتھر بجائے بکری کے لگنے کے اُن مرتبانوں پر لگا جن میں صحائف رکھے ہوئے تھے۔ مرتبانوں کے ٹوٹنے کی آواز سے وہ خوفزدہ ہو کر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد اپنے ایک ساتھی کو لے کر وہ غار میں داخل ہوا۔ وہاں پر بہت سے مٹی کے مرتبان پڑے ہوئے پائے۔ یہ مرتبانوں کو باہر لایا۔ ان میں کچھ کاغذات خستہ حالت میں بوسیدہ کپڑوں میں لپٹے ہوئے تھے۔ محمد ابن الذئب بہت مایوس ہوا۔ اس کو بالکل معلوم نہ تھا کہ اس کو کیا چیز مل گئی ہے۔ وہ سمجھتا تھا کہ شاید ان مرتبانوں میں سونے کے سکے ہوں گے لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری۔ تھوڑے عرصہ میں اس نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے اور مرتبان برآمد کئے جن میں پھر اسی طرح کے کاغذات لپٹے ہوئے تھے۔ یہ ان کو لے کر یروشلم (جو کہ قمران سے تھوڑے ہی فاصلے پر ہے) گیا۔ ماہرین آثار قدیمہ اور دوسرے علماء کو اُس نے یہ کاغذات دکھلائے۔ ایک شامی پادری نے ان میں سے چار صحائف کو خرید لیا۔ کچھ عرصہ کے بعد باقی صحائف کو عبرانی یونیورسٹی کے ایک پروفیسر نے ایک دلال کی معرفت بیت اللحم میں خرید لیا۔

ماہرین نے یکے بعد دیگرے شامی پادری کے خرید کردہ صحائف کو دیکھا مگر وہ کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکے۔ دراصل وہ ان کی اہمیت تو سمجھ گئے تھے۔ مگر اپنے صدیوں کے اعتقادات پر ضرب پڑتے دیکھ کر شامی پادری کو صحیح بات نہ بتا سکے اور صحائف ہی کو بے کار قرار دیدیا۔ شامی پادری نے صحائف کو بالآخر امریکہ کے مشرقی (ORIENTAL) ادارہ تحقیق میں جو کہ یروشلم میں واقع ہے بھجوا دیا — عبرانی زبان کے مخروطی طرز نگارش کو دیکھ کر ادارہ کے علماء نے ان کی اہمیت کا

---

[1] قمران کا علاقہ بحر مردہ کے کنارے چاند جیسی نوکدار اور گھری پہاڑیوں کی طرح صحرا جو ڈپاکے بالکل کھنڈر اور اُجاڑ علاقہ میں خاموشی کے ساتھ اپنے ماضی کی سرگوشیاں کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ چھوٹی پہاڑیوں میں سے گذر کر سامنے قمران نظر آتا ہے پہاڑیاں کچھ اس طرح معلوم ہوتی ہیں گویا کسی نے باضابطہ تراش دیا ہو۔ قمران کے دائیں جانب ایک بڑا قبرستان ہے جہاں پر آج ہزاروں قبریں گنی جا سکتی ہیں۔ قریب ہی دائیں جانب بحر مردہ ہے۔

اندازہ کرلیا۔ انھوں نے ان صحائف کی تصویریں اور کچھ اصلی تقطعات (کتاب یسعیاہ ISAIAH) وغیرہ امریکہ روانہ کئے وہاں کے ماہرین اور علماء نے جو عبرانی زبان پر قدرت رکھتے ہیں ان صحائف کا بغور مطالعہ کیا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ یہ صحائف حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے سو سال پہلے کے تحریر شدہ ہیں اور اس دور کی عجیب و غریب دریافت ہیں۔ مزید سائنٹفک تحقیقات نے یہ حتمی طور پر ثابت کردیا کہ صحائف کم از کم انیس سو سال پرانے ہیں۔ اب تک جتنے پرانے صحائف عہدِ عتیق (OLD TESTAMENT) ۔ اور انجیل (NEW TESTAMENT) کے متعلق ملے ہیں، یہ صحیفے اُن سب سے ایک ہزار سال پرانے ہیں۔

محدین الذہب کی اس اچانک دریافت نے جو مندرجہ ذیل صحائف کے دریافت کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوئی عہد نامہ عتیق کی تعلیمات پر غیر معمولی روشنی ڈالی ہے اور موجودہ دنیائے عیسائیت میں زبردست ہلچل مچادی ہے۔

(۱) دو صحائف کتاب یسعیاہ (ISAIAH)

(۲) روئیداد حباکک (BOOK OF HABAKUK)

(۳) ایسینی جماعت کے قواعد و ضوابط (MANUAL OF DISCIPLINE)

(۴) آرامی زبان میں کتاب پیدائش (BOOK OF GENESIS) کا آزاد ترجمہ

(۵) دعائیں اور مناجاتیں۔ (THANKS GIVNIG PSALMS)

(۶) خدا کے فرمانبرداروں و نافرمانبرداروں کے درمیان جنگ کا حال

THE WAR BETWEEN THE CHILDREN OF LIGHT & THE CHILDREN OF DARKNESS

(۷) خدائی و غیر خدائی طاقتوں کی آویزش (APOCALYPTEC CLASH)

ان صحائف کو دنیائے عیسائیت نے بالکل ناکارہ قرار دیا تھا۔ مگر اسرائیل کی عبرانی یونیورسٹی نے انھیں ڈھائی لاکھ ڈالر (قریباً بارہ لاکھ روپیہ) میں خرید لیا۔ اب یہ یونیورسٹی اس بات کا انتظار کررہی ہے کہ ان کی ایک خصوصی کتب خانہ میں نمائش کی جائے

عربوں اور یہودیوں کی دیرینہ مخاصمت جو کہ سنہ ۱۹۴۸ء کے موسم بہار میں ایک باضابطہ جنگ کی شکل میں نمودار ہوئی تھی اس کی وجہ سے آثار قدیمہ کے ماہرین اُس مقام تک نہ پہونچ سکے۔ جہاں سے یہ نادرالوجود صحائف دریافت ہوگئے تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد فلسطین اور شرق اردن کے آثار قدیمہ کے سربراہوں کی نگرانی میں ایک مہم اُس غار کی جانب سنہ ۱۹۴۹ء کے اوائل میں روانہ ہوئی تھی۔ دونوں علاقوں کے ماہرین نے غار کے اندر کے حصہ کو بُری طرح تہ و بالا دیکھا۔ افسوس تو بہت ہوا مگر ہمت نہ ہاری۔ تمام کوڑا کرکٹ دور کرنے اور تلاش بسیار کے بعد وہ ستر صحائف کے پرزے اور چمڑے کے ٹکڑے برآمد کرنے میں کامیاب ہوگئے۔

ایک بہت پرانا کھنڈر جو کہ غار سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر تھا۔ ماہرین کی توجہ مبذول کرانے کا باعث ہوا۔ یہ جگہ خرابۂ قمران کہلاتی ہے۔ بحرِ مردہ کے کنارے ایک اونچے پہاڑی علاقہ میں یہ کھنڈرات اپنی داستان عبرت بزبانِ خاموشی کہہ رہے ہیں اور زائرین کو دعوتِ غور و فکر دے رہے ہیں۔

آس پاس کا علاقہ بالکل خشک اور بنجر ہے۔ پتھریلا اور صدیوں کی دھوپ و تپش کی وجہ سے جلا ہوا سا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن کیا ماہرین خرابۂ قمران کو پتھریلا اور بنجر علاقہ سمجھ کر چھوڑ سکتے تھے۔ دراصل یہی وہ جگہ ہے جہاں پران صحائف کے کاتبوں اور قاریوں کا حال معلوم ہو سکتا تھا۔ وہ کون لوگ تھے جنھوں نے یہ صحائف یہاں پر چھپائے۔ کیوں اور کب چھپائے ماہرین نے فیصلہ کیا کہ ان کھنڈرات کا اچھی طرح جائزہ لیا جائے۔ ابتدائی کھدائی کا کام شروع کیا گیا مگر کوئی اہم بات معلوم نہ ہو سکی۔ بدرجہ مجبوری مزید کارروائی بند کرنی پڑی۔ غاروں میں سے جو بھی ملنا تھا مل چکا تھا۔ بظاہر ان صحائف اور قمران میں کوئی تعلق نہیں پایا جاتا تھا۔ تاہم محمد ابن الذہب کی یہ دریافت ایک عجیب اور ناقابلِ حل معمہ معلوم ہوتی تھی۔

شاید یہ مسئلہ لاینحل ہی رہ جاتا اگر طامرہ کے غریب اور مفلوک الحال بدو اس معاملے میں پھر سے گرم جوشی نہ دکھاتے۔ ادھر اُن کی انتہائی تگ و دو اور جانکاہ محنت اور اِدھر یروشلم کے علماء کی دلچسپی نے آخرکار بدوؤں کے شوق و جستجو کو اور تیز کیا۔ آس پاس کے غاروں کی اور تلاش شروع ہوئی۔ انتہائی جذب و شوق میں صحرائے (JUDAEA) کے چپے چپے کو چھان مارا۔ اور اُن مقامات کو جہاں سے کسی چیز کے مل جانے کی توقع ہو سکتی تھی اُس کی تلاش و جستجو میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا۔

آخرکار ۱۹۵۲ء میں تلاشِ بسیار اور پانچ سال کی جانکاہ مشقت اور سینکڑوں غاروں کے دیکھنے کے بعد قمران کے قریب ہی ان کو چمڑے کے کچھ اور ٹکڑے ملے۔ یہ چمڑے کے ٹکڑے ایک بار پھر جواہرات سے زیادہ قیمتی ثابت ہوئے۔ جیسے ہی ان چمڑے کے ٹکڑوں کی دریافت کی اطلاع یروشلم میں پہنچی امریکی ادارہ آثارِ قدیمہ کے مشرقی تحقیقاتی شعبے نے ماہرین کی ایک جماعت روانہ کی۔ اور دوسری جانب فلسطینی آثارِ قدیمہ کے سربراہوں کی زیرِ نگرانی ایک جماعت موقع پر پہونچی۔ پھر تحقیقات شروع ہوئی۔ کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا گیا۔ غاروں اور کونوں کی پھر سے تلاش شروع ہوئی۔ آخرکار جوئندہ یابندہ۔ اس جانکاہ اور جاں گسل تلاش کے بعد ایک اور ذخیرہ ہاتھ آیا۔ چمڑے کے ٹکڑوں کے علاوہ تانبے کے گول تہہ کئے ہوئے پتر ملے۔ امتدادِ زمانہ نے ان کو اس قدر خستہ، خراب اور بےکار کر دیا تھا کہ وہ نہ تو پڑھے جا سکتے تھے اور نہ اُن کی تہہ کھولی جا سکتی تھی۔ اس واقعہ کے چھ ماہ بعد اَن تھک بدوؤں نے پھر ایک نئے غار (غار نمبر ۴) کو تلاش کر لیا۔ اس غار میں صدیوں کے جمع کئے ہوئے کوڑے کرکٹ کے نیچے اسینیوں کے بڑے کتب خانے کے ہزاروں ٹکڑے جو قریب قریب چار سو صحائف سے متعلق تھے دریافت ہوئے۔ اس وقت سے اس وقت تک تلاش برابر جاری ہے اور اس کا

سہرا طامرہ کے بدوؤں اور ماہرین دونوں کے سر پر باندھا جا سکتا ہے۔ تازہ ترین دریافت غار نمبر ۱۱ کی ۱۹۵۶ء میں ہوئی یہ سعادت بھی بدوؤں کے حصے میں آئی۔ یہاں سے بھی چمڑے پر لکھے ہوئے بالکل صحیح حالت میں صحائف دریافت ہوئے ہیں۔ یہ پہلا موقع ہے کہ صحائف اپنی اصلی حالت میں (محمد ابن الذہب کے اتفاقیہ طور پر پتھر پھینکنے کے بعد) دریافت ہوئے ہیں۔ اس سے پہلے شرق اردن کے ماہرین اور علما نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وادی قمران کے کھنڈرات کی مکمل تحقیق کی جائے۔ ۱۹۵۱ء میں کھدائی کا کام بڑے پیمانے پر شروع ہوا۔ اس کے نتائج جہاں تعجب خیز ہیں وہاں حوصلہ افزا بھی ہیں۔

آج قمران کو صدیوں کے کوڑے کرکٹ اور گرد و غبار کے انباروں سے بالکل صاف کر دیا گیا ہے۔ کھنڈرات اور مکانات کے ڈھانچے اب بالکل صاف ہو چکے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بحر مُردہ کے کنارے کھڑے کسی گہری سوچ میں یہ کسی اور زمانے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ اس خستگی اور کہنگی کے باوجود تمام عمارتوں کے آثار بالکل الگ الگ اور نمایاں نظر آتے ہیں۔ یہاں پر جو برتن ملے ہیں وہ ان مرتبانوں سے ملتے جلتے ہیں جو کہ قریب کے غاروں سے برآمد ہوئے ہیں۔ قمران کی کھدائی اور صفائی سے صحائف پر جو صدیوں سے پردے پڑے ہوئے تھے وہ ہٹ چکے ہیں۔ حقیقت بے نقاب ہو گئی ہے اگر اس مرکز کے عریض و وسیع میدان کو مدنظر رکھا جائے اور ان کھنڈرات کو بغور دیکھا جائے تو اُن نیک اور پاکباز لوگوں کی روزمرہ زندگی کا پورا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ جنھوں نے اس مرکز کو تعمیر کیا۔ جس میں ان کا قیام قریب دو سو سال رہا۔ شاید اُن لوگوں نے اپنی آنکھوں سے رومی فوجوں کے ہاتھوں سے اس کی تباہی بھی دیکھی ہو گی۔

آثار قدیمہ کی شہادت۔ سب سے بڑی صحائف کی شہادت اور بلاواسطہ پرانے مورخین کی شہادت یہ ظاہر کرتی ہے۔ کہ یہ لوگ اسینی (ESSENE) مسلک سے متمسک تھے۔ یا بالکل اُن جیسی کسی اور جماعت سے۔ دنیا کے آرام و آسائش کو خیرباد کہہ کر یہ اسرائیلیوں کا "طائفہ خیر" قمران میں مجاہدانہ اور سادہ زندگی گذارتا تھا۔ قوانین قدرت کا مطالعہ۔ مکافات عمل پر غور اور قیامت کا انتظار کیا کرتے تھے۔ ان کے خیال میں دنیا کی تباہی نزدیک تھی اور سب آخری دن کے منتظر رہتے تھے۔ ایک محقق کا بیان ہے کہ میں نے خود ان کھنڈرات کا معائنہ کیا ہے۔ ان کی خاموش زبانی نے مجھے بہت مرعوب کیا۔ ان کی گذشتہ عظمت اور پاک زندگی میرے سامنے تھی۔ بحر مُردہ کے لمبے چوڑے چٹیل اور جھلسے ہوئے علاقہ میں ہوتے ہوئے ہم مرکز کی جانب روانہ ہوئے۔ راستہ پہاڑی پر چکر کھاتا ہوا جاتا ہے۔ پیدل اور خچر اور گدھے اس پر باسانی چڑھ سکتے ہیں۔ موٹر کی سواری خطرناک ہے۔ میں نے کئی بار اس راستہ پر موٹر لے جانے کی کوشش کی مگر ناکامی ہوئی۔ مگر میرے رہنما کو وہاں پر موٹر چلانے میں کوئی دقت نہ ہوتی تھی۔ قمران میں داخل ہوتے ہی ہم سب سے پہلے اوپر کی منزل (بالاخانہ) پر پہنچ گئے۔ سامنے ایک قلعہ نما مینار نظر آیا۔ آثار قدیمہ کے ماہرین کا خیال ہے کہ اس مینار کی دیواریں ایک خوفناک زلزلہ کے بعد دوبارہ ۳۱ سنہ قبل مسیح میں بنی تھیں۔ اس قلعہ نما مینار سے دور دور نظر جاتی تھی۔ اس پاس

کے علاقے کے ڈاکوؤں اور معمولی لٹیروں کے حملوں کو پسپا کر دیا جاتا تھا۔ لیکن یہ قلعہ رومیوں کے باضابطہ حملے کی تاب نہ لاسکتا تھا اور نہ لا سکا۔

اب جو بھی ان کھنڈرات کو چل پھر کر دیدۂ بینا سے دیکھتا ہے وہ ایسا محسوس کرتا ہے کہ سورج کی تیز اور جھلسنے والی کرنیں اُس پر آج اُسی طرح پڑ رہی ہیں جس طرح کسی زمانے میں اسینیوں پر پڑا کرتی تھیں۔ وہی سخت اور جھلسا دینے والی لُو اب بھی بحرِ مُردہ کے کنارے سے اسی طرح آتی ہے جیسی اب سے دو ہزار قبل آتی تھی۔ وہ کچھ دیر کے لئے اپنے آپ کو ایک دوسری دنیا میں پاتا ہے اور ذرا غور کرنے سے اسینیوں کی طرزِ بود و باش بالکل اُبھر کر اور نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔

اس جماعت کا بانی ایک بڑا پجاری (PRIEST) تھا جس کو اُس کے متبع حق و صداقت کا پیکر کہتے تھے اور سمجھتے تھے کہ خدا نے اپنے پیغمبروں پر بھیجے ہوئے تمام پیغامات اِسکو بتلا دیئے ہیں۔ اس بانیٔ جماعت کے خیال کے مطابق قیامت قریب آپہنچی ہے۔ مکافاتِ عمل اور روزِ جزا نزدیک ہے۔ اور خدا اُس دن نیکوں کو اُن کی نیکیوں کا اجر اور بدوں کو ان کی بداعمالیوں کی سزا دینے کے لئے آئے گا۔ صحائف سے بھی ان لوگوں کے کچھ حالات معلوم ہوئے ہیں۔ اس فرقہ (جماعت) کا وجود دو سو سال قبل مسیح میں تھا جبکہ ہسمانی (HASMONAEAN) خاندان اسرائیلیوں پر حکومت کرتا تھا۔ ہسمانی بحیثیت پجاریوں کے ذادک (ZADOK) کے باضابطہ اور اصلی وارث نہ تھے۔ پجاریوں کا منصب انھوں نے غصب کیا تھا۔ یہ حکمراں آجکل کی میکیاولی سیاست پر عمل پیرا تھے۔ ہر وقت اندرونی۔ بیرونی سازشیں اور عیاری اور مکاری میں لگے رہتے تھے۔ اپنے آپ کو سچا اسرائیلی یا یہودی کہتے تھے۔ مگر نیک اور سچے یہودیوں کے نزدیک یہ یہودیت کی بیخ کنی میں زیادہ رہا کرتے تھے۔ ان کے لئے روئیداد حباکوک (HABAKKUK COMMENTRY) میں مندرجہ ذیل حوالے آئے ہیں۔

"پُرفریب شخص" "جھوٹا پیغمبر" "بدمعاش پجاری" یہ لوگ اپنے حکم کو خدا کا حکم بتلاتے تھے اور ہمیشہ یہ کہہ کر ڈرایا کرتے تھے کہ انھوں نے اِن کا حکم نہ مانا تو وہ خدا کے غضب کا شکار ہوں گے۔ نیک لوگوں اور صحیح پیرووں پر بڑی سختی کرتے تھے۔ یہ اشارے غالباً ہسمانیوں کے خاندان کے افراد جان ہرقانوس (JOHN HYR CONUS) اور اس کے بعد میں آنے والے لوگوں کی طرف ہیں۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ اشارے "بدمعاش پجاری" "جھوٹا پیغمبر" وغیرہ جوناتھن یا سائمن کے بارے میں ہیں جو ١٦٠ء اور یا ١٤٢ء قبل مسیح میں حکمران تھے۔ ان مستبد حکمرانوں نے اسینیوں (ESSENES) کے اصلی پیشواؤں کے حقوق کو پامال کیا تھا اور خود ان کے جانشین بن گئے تھے۔ یروشلم کے مفاد پرست اور ہوس پرست طبقہ کی گھناؤنی لادینیت سے مجبور ہو کر انھوں نے اپنے چند رفقاء اور ساتھیوں کو لے کر اس صحرا کو آباد کیا جس کو قمران کہتے ہیں۔ وہاں سے بہت سی شہادتیں اس امر کی ملی ہیں کہ انھوں (ESSENES) نے

اپنا یہ مستقر بحرِ مُردہ کے کنارے دو سو سال قبل مسیح قائم کر لیا تھا۔ ان کے ضابطِ ہدایت کے مطابق اِس ہجرت کی پیشگوئی ان کے بڑے پجاری نے اس طرح کی تھی ــــ "تیار ہو جاؤ اپنے خدا کے راستہ پر چلنے کے لئے۔ سیدھی صحرا کی راہ لو، کیونکہ یہی خدا تک رسائی کا ایک ذریعہ ہے"۔ اس ایمان اور یقین کے ساتھ کہ وہ ایک نئے دور کا آغاز کر رہے ہیں خدا کے ان نیک بندوں اور سچے پیروؤں نے وادی قمران میں ایک بلند مقام کو جو بحرِ مُردہ کے شمال و مغرب میں واقع ہے اپنی پناہ گاہ اور مرکز بنایا۔ یہ مقام ایک علیحدہ گوشہ میں وادی اردن کے قافلوں کی گذرگاہوں سے کافی دور واقع ہے۔ قریب ہی جنوب میں "عین فشاخ" کا نخلستان ہے جہاں سے پانی بآسانی مہیا ہو جاتا تھا۔ کچھ عرصہ بعد ایسینیوں نے مغربی پہاڑیوں سے پانی حاصل کرنے کے لئے ایک پُل بنایا۔ ان کھنڈرات میں اس محقق کا کہنا ہے کہ میرے لئے پانی لانے کا یہ طریقہ بڑا حیرت انگیز اور دلچسپی کا باعث ثابت ہوا نالیوں کا جال ہر طرف بچھا ہوا تھا۔ ہر جگہ پانی پہنچ سکتا تھا جو بڑے تالابوں، حوضوں اور غسل خانوں میں جا کر جمع ہو جاتا تھا۔ جو لوگ پانی کے اس طرح لانے اور نالیوں کے ذریعہ اس طرح تقسیم سے ناواقف ہیں وہ شاید اس میں دلچسپی محسوس نہ کریں۔ ایک نالی اور دوسری نالی میں فرق برائے نام تھا مگر تھا بہت ہی لطیف اور نازک غسل خانوں اور حوضوں تک پہنچنے کے لئے سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ میرے رہنما نے تو وہ غسلخانوں کی صحیح نشان دہی بھی کر دی۔ میں نے پوچھا کہ تم غسل خانوں اور حوضوں میں کس طرح تمیز کرتے ہو۔ اس نے جواب دیا کہ جو بہترین طریقہ پر بنے ہوئے ہیں وہ غسل خانے ہیں اور جو صرف مضبوط ہیں وہ حوض ہیں۔

یہ لوگ صفائی پر بہت زور دیتے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایسینی صرف پانی ہی کی فکر میں ہر وقت رہتے تھے پانی کی فکر تھی بھی حق بجانب۔ دشت اور صحرا میں پانی سے زیادہ قیمتی اور جان سے زیادہ عزیز اور کیا چیز ہو سکتی ہے۔

ایسینیوں کے شعار میں طہارت، پاکیزگی اور صفائی کو ایک مقدس حیثیت حاصل تھی[1]۔ ظاہری صفائی روح کے گناہوں کی صفائی خیال کی جاتی تھی اور سچے بنی اسرائیل کی علامت شمار کی جاتی تھی۔ یہ ایک بپتسمہ سا ہوتا تھا۔ لیکن اس قسم کا جو کئی بار ہو سکے۔ ایسینی اپنے مراکز اور ملحقہ مکانات کی صفائی کے لئے پانی استعمال کرتے تھے۔ میرے رہنما نے اس کی شہادت سب سے بڑے ہال کی دیواروں سے دکھلائی۔ یہ ہال کافی لمبا اور نسبتاً کم چوڑا تھا۔ اس سے ملحق ایک مطبخ اور کھلنے کا

---

[1] ایسینیوں کی زندگی میں جسمانی صفائی کو بہت اہمیت دی جاتی تھی۔ قمران کے مرکز میں بہت سے حمام، غسل خانے اور چھوٹے تالاب بنے ہوئے تھے جن میں کچھ غسل کے لئے مخصوص تھے۔ جب کوئی نیا آدمی اس جماعت میں داخل ہوتا اسکی صفائی و پاکیزگی کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا تھا۔ باضابطہ طور پر اس کو غسل کرایا جاتا۔ یہ ایک قسم کا بپتسمہ سا ہوتا تھا۔ آجکل کے عیسائیوں کی طرح نہیں جبکہ زندگی میں صرف ایکبار یہ رسم ادا کی جاتی ہے۔ قمران میں یہ رسم روزانہ بلکہ دن میں کئی بار ہوتی تھی۔ قدیم مورخین بھی اس سے متفق ہیں۔ قاعدہ یہ تھا کہ ان کا ایک چھوٹا سربراہ اپنے سامنے ہر ممبر کے داخلے پر یہ رسم خود ادا کراتا تھا۔ ایک شخص مخالف سمت سے دعائیں پڑھتا جاتا تھا اور پاس کھڑے ہوئے لوگ اُس شخص کے واسطے ثابت قدمی اور استقامت کی دعائیں کرتے تھے جب یہ رسم پورے طور پر ادا ہو جاتی تو نئے ممبر کو پانی سے باہر آنے کی اجازت ہوتی اور ایک بڑی سفید چادر اس کو پہننے کے لئے دیدی جاتی۔

کمرہ تھا۔ جہاں سے بہت سی رکابیاں خوبصورتی کے ساتھ رکھی ہوئی ملی ہیں۔ اس ہال میں جماعت کے تمام افراد مل کر کھانا کھاتے تھے اور ساتھ ہی عبادت بھی کرتے تھے۔ کمرے کے سرے پر فرش سے اُبھرا ہوا ایک چبوترہ تھا جس پر کھڑے ہو کر ان کا پیشوا یا جماعت کا کوئی اور شخص حاضرین کو وعظ و تلقین کرتا تھا۔[1]

ایسینی صحائف کے ان احکامات کی کہ "تیرا کوئی قول اور فعل اُس کتاب قانون کے خلاف نہ ہو" اور "کوئی فرد ایسا باقی نہ رہ جائے جو توراۃ (کتاب قانون) کی تبلیغ دن اور رات قولاً و عملاً اپنے ساتھیوں میں نہ کرتا ہو" بڑی سختی سے پابند تھے۔ اور ہر فرد کو اپنے قول اور عمل سے اس کا مظاہرہ کرنا پڑتا تھا۔

بڑے ہال اور کھانے کے کمروں میں فرش ڈھلوان بنے ہوئے تھے۔ ایک کونے میں تمام پانی جمع ہو کر باہر نکل جاتا تھا۔ بالمقابل کونے میں پانی آنے کے لئے نالی بنی ہوئی تھی۔ ہال اس طرح بآسانی صاف کیا جا سکتا تھا۔ صرف پانی آنے والی نالی کا ڈھکنا اٹھانا پڑتا تھا۔ پانی اندر آتا اور فرش کو صاف کرتا ہوا باہر چلا جاتا۔ اس چھوٹی سی منضبط جماعت کو تمام ضروریاتِ زندگی بآسانی حاصل ہو جاتی تھیں۔ اس محقق کا بیان ہے کہ میں نے تمام طعام خانوں اور برتنوں کو بغور دیکھا۔ برتن بنانے کے لئے اور صاف کرنے کے لئے چونے بنے ہوئے تھے۔ قریب ہی ایک بڑے گڑھے میں جس کے چاروں طرف مضبوط پتھروں کی دیواریں بنی ہوئی تھیں۔ ان میں سے برتن بنانے کے لئے مٹی تیار کی جاتی تھی[2] قریب ہی ایک بڑا برتن بنانے کا پاٹ زمین میں لگا ہوا تھا۔ جس کو پیروں سے گھمایا جاتا تھا۔ اور دوسرا آدمی برتن ڈھالتا تھا۔ اس قسم کے پاٹ

---

[1] صحیفہ کے الفاظ "میرے دل کی پاکیزگی کا ثمر میری زبان سے ظاہر ہوگا"۔ قمران میں سوائے باضابطہ ممبروں کے جو اوروں کے لئے صفائی قلب اور تزکیہ نفوس کے ذمہ دار تھے کوئی اور جماعتی کھانے میں شریک نہیں ہو سکتا تھا۔ مورخین کا خیال ہے کہ ایسینی کھانے کے کمرے میں اس طرح مؤدبانہ انداز سے داخل ہوتے تھے جیسے کسی عبادت خانہ میں جا رہے ہوں۔ اور صحائف سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ ان کا سردار کس طرح اپنے دونوں ہاتھ دعا کے لئے کھانا کھانے سے قبل اٹھایا کرتا تھا۔ ایسینوں کی روایات کے مطابق کھانا بہت سادہ ہوتا تھا۔ تکلف کا نام و نشان نہ تھا۔ صرف ایک قسم کا کھانا ایک وقت میں ملتا تھا۔ آثار قدیمہ کے ماہرین نے ایسے برتن تلاش کئے ہیں جن میں بھیڑوں، بکریوں اور گائیوں کی ہڈیاں تک ملی ہیں جن کو یہ لوگ کھانے کے بعد ایک طرف جمع کر دیتے تھے۔ کمرے میں دن میں روشن دان سے روشنی کافی سمجھی جاتی تھی دروازے بند ہوتے تھے۔ کھانے کے دوران میں ان کا ایک امیر ایک چھوٹے سے چبوترے پر کھڑے ہو کر موقع کی مناسبت سے صحائف کے معانی و مطالب سمجھایا کرتا تھا۔ دوسرا صحائف لئے ہوئے قریب ہی کھڑا رہتا۔ تاکہ بوقتِ ضرورت مقررہ کو امداد دی جا سکے۔ ہر ایک کے سامنے ایک مٹی کا پیالہ اور رکابی ہوتی تھی۔ پانی کی صراحیاں دیواروں پر لگی رہتی تھیں اور لوگ کھانے کھانے اور لانے میں مصروف ہو جاتے تھے تاکہ حاضرین کو کھانے کے دوران میں باہر جانا نہ پڑے اور تقریر میں کسی قسم کا خلل نہ آنے پائے۔ لوگ تقریر اور بیان کو انتہائی دلچسپی سے سنتے تھے اور بعض اوقات تو انہماک اس قدر بڑھ جاتا تھا گویا کھانے کا خیال ہی نہیں رہتا تھا۔ [2] صحیفہ کا ترجمہ "تو نے مٹی سے بنی ہوئی شے کو کس قدر مضبوط اور پاکیزہ بنایا"۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

آجکل (HEBRON) میں پائے جاتے ہیں۔ یہاں پر بہت سے پتراوے (KILNS) بھی ملے ہیں۔ یہاں راکھ اور لوہے کی بھٹیاں تھیں۔ گودام۔ لوہار کا کام کرنے کی جگہ اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ قمران کے یہ نیک لوگ اُس زمانے کی صنعت و حرفت اور جدّت (ENTERPRISE) میں کسی سے پیچھے نہ تھے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے پاس سرمایہ کہاں سے آتا تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ سرمایہ جماعت خود مہیا کرتی تھی۔ جو بھی اس گروہ میں شامل ہوتا تھا اپنا دنیاوی مال و متاع سب کچھ بیت المال میں جمع کر دیتا تھا۔ بیت المال کا نگران، سب کے مال کا امین کہلاتا تھا۔ مالی معاملات اُس کے سپرد تھے۔ یہاں سے خیال فوراً حضرت عیسیٰؑ اور ان کے ساتھیوں کی جانب منتقل ہو جاتا ہے جو اپنے دور میں اسی اصول پر چلتے تھے۔ جس کے حوالے انجیل میں کہیں کہیں آج بھی ملتے ہیں۔ ایک اور بڑا کمرہ (ہال) خاص توجہ کا موجب ہوا۔ اس میں آثار قدیمہ کے ماہروں نے اوپر کی منزل کے گرے ہوئے آثار دیکھے ہیں۔ رومیوں کے حملے کی تاب نہ لاکر یہ حصّہ گر گیا تھا۔ اس ملبہ میں جو چیزیں ملی ہیں اُن میں پلستر شدہ میزیں اور بنچیں ہیں جن پر بیٹھ کر یہ لوگ صحائف لکھا کرتے تھے بڑی نمایاں ہیں اور یہ وہی صحائف ہیں جن کو ان لوگوں نے رومیوں کے حملے سے قبل غاروں میں چھپا دیا تھا۔ یہاں پر دواتیں نیز وہ گڑھے ملے ہیں جہاں پر یہ لوگ کام شروع کرنے سے پہلے اور ختم کر لینے کے بعد ہاتھ دھویا کرتے تھے۔ اوپر کی منزل کے یہ دونوں کمرے جو صحائف لکھنے کے لئے مخصوص تھے۔ یہاں سے ساری جماعت کو زندگی کے اصول بتلائے اور سکھلائے جاتے تھے۔ دراصل یہ محور تھے جس کے گرد ان کی زندگی گھومتی تھی۔ ان ہی کمروں میں ایسینیوں کی زندگی کے قواعد و ضوابط مرتب ہوتے تھے۔ قمران کے ایسینیوں کے لئے ضروری تھا کہ وہ سب ساتھ کھائیں۔ عبادت میں ساتھ ہوں۔ دعاؤں میں ایک دوسرے کو یاد رکھیں۔ ایک پیشوا یا امیر کے تحت زندگی گذاریں۔ بغیر پیشوا یا امیر کے ایسینیوں میں زندگی گذارنے کا تصور قطعاً نہ تھا۔ پیشوا یا امیر کا ہونا ناگزیر تھا۔ ایسے پاک و صاف ماحول میں ان کی باہمی زندگی ایک پُر امید ماحول میں گذرتی تھی۔ باہمی رشتہ بڑا استوار اور مضبوط تھا۔ اس طرح یہ یقین ایمان اور اطمینان قلبی کے ساتھ آنے والے دن کی تیاری میں مصروف رہتے تھے۔

لیکن یہ زبردست روحانی طاقت جس سے ان کے سینے روشن تھے یہ سب طاقت صحائف کی نگرانی اور

(بقیہ حاشیہ گذشتہ صفحہ) بہت سے صحائف اصلی حالت میں مل گئے ہیں۔ وہ مٹی کے مضبوط بنے ہوئے مرتبانوں میں تھے۔ انکی پختگی کی وجہ سے ایسینی اپنے صحائف احتیاط سے رکھا کرتے تھے۔ پرانے زمانے میں مٹی کے برتنوں میں عام طور پر ایسی چیزوں کو رکھا جاتا تھا۔ اس کے حوالے (JEREMIH) اور حضرت موسیٰؑ کی روایات میں بھی ملتے ہیں۔ قمران میں بھٹے بھی تھے مٹی کو بڑی احتیاط سے تیار کیا جاتا تھا اور جب تک ہر برتن آدمی اس کے صحیح ہونے کی تصدیق نہ کر دیتے تھے۔ برتن نہیں بنائے جاتے تھے مرتبان اور برتن تیار ہونے کے بعد اور اچھی طرح سوکھ جانے کے بعد بھٹی میں پہنچا دیئے جاتے تھے۔ برتن میں لگی رہ جانے کے باعث برتن کے پھٹ جانے کا اندیشہ تھا۔ تقسیم کار باقاعدہ تھی۔ لڑکے اور لڑکیاں بھی کام کیا کرتے تھے۔ مثلاً ایندھن وغیرہ کا جمع کرنا۔

صحیح کتابت میں صرف ہوتی تھی۔ یہاں پر کاتب ازمنہ قدیم کی یہودی روایات اور کتبوں کی نقل کیا کرتے تھے اور زمانے کے بدلتے ہوئے حالات اور آنے والے دور کی کشمکش سے نبرد آزما ہونے کے لئے صحائف کے معنی و مطالب پیش کرتے رہتے تھے۔ آنے والے خطرات سے مطلع کرنا اور اُن کا مقابلہ کرنے کے لئے تمام لوگوں کو تیار کرتے تھے۔ یہاں پر یہ خدا کے نیک بندے اُس کا نام بلند کرنے کے لئے ہر وقت کوشاں رہتے تھے۔ اور اس حتم اور یقین کے ساتھ کہ ان کی یہ مساعی ضرور بالضرور کسی نہ کسی دن کامیاب ہوں گی۔ آنے والے لوگ اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔ اور اس طرح یہ لوگ نجات پا جائیں گے۔

کوئی جماعت خواہ اس کے مقاصد کتنے ہی بلند و بالا کیوں نہ ہوں اور کتنی ہی منضبط کیوں نہ ہو اس کے لئے ایک امیر یا لیڈر کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ ایسینی جماعت کے تمام اراکین ایک دوسرے کے برابر تصور کئے جاتے تھے اور کوئی کسی پر فوقیت نہیں رکھتا تھا اور ہر ایک کو اپنے خیالات کے اظہار کا موقع بھی ملتا تھا۔ تاہم اُن میں ایک چھوٹا سا حلقہ تھا جو کہ مجلس شوریٰ کے فرائض انجام دیتا تھا۔ یہ مجلس اس سارے نظام کی روح رواں تھی۔ یہ مجلس جیسا کہ ان کے قواعد و ضوابط بتلاتے ہیں پندرہ اشخاص پر مشتمل ہوتی تھی۔ بارہ ان میں منتخب ہوتے تھے اور تین اُن کے بڑے پجاری۔ اور یہ مجلس اس مرکز کے امیر کی زیر صدارت ہوا کرتی تھی۔ مذکورہ صدر محقق کا بیان ہے کہ میرے رہنما نے جنھوں نے یہاں کی ہر چیز کو انتہائی غور اور غائر نظر سے دیکھا ہے۔ اور جنھوں نے اپنے ذہن کو اُن لوگوں کی روزانہ زندگی اور تصورِ حیات سے اس قدر ہم آہنگ کر لیا ہے انھیں محسوس ہوتا ہے کہ جس مقام پر یہ لوگ مشاورت کرتے تھے۔ وعظ و تلقین کرتے تھے۔ دعوتیں کرتے تھے۔ نہاتے تھے اور دیگر ضروریاتِ زندگی کی مصروفیات میں مشغول رہتے تھے۔ گویا اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ کونسل چیمبر جیسا کہ یہ لوگ اُس بڑے ہال کو موسوم کرتے ہیں در اصل نہ تو بڑا ہال اور نہ بڑا کمرہ تھا۔ لیکن بہت سے (FEATURES) میرے رہنما کے خیال کی تائید کرتے ہیں۔ سب سے پہلے ایک بنچ کمرے کی دیوار کے ساتھ ساتھ بنی ہوئی ہے۔ اور بظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ جماعت کی مجلسِ شوریٰ کے لئے بنی ہوئی تھی۔ مزید برآں ایسینیوں کی اس مجلسِ شوریٰ کو قمران کی سخت گرمی اور خشک موسم میں پانی کی ضرورت محسوس ہوتی تھی اس کا انتظام ہر وقت رکھا جاتا تھا کہ بافراط پینے کا پانی ہر وقت مہیا ہو۔ اہم مشوروں میں کوئی غیر یا کم درجہ کا ممبر بھی داخل نہیں ہو سکتا تھا چاہے وہ ٹھنڈے پانی کی صراحی ہی لیکر کیوں نہ آیا ہو۔ کونسل چیمبر کی ساخت بآسانی اس معمہ کو حل کر دیتی ہے۔ دیوار کے اندر ایک گڑھا تھا جو پانی جمع کرنے کے کام آتا تھا۔ ایک چھوٹی سی نالی دیوار میں بنی ہوئی تھی جس کے ذریعہ باہر سے پانی آکر گڑھے میں جمع ہو جاتا تھا۔ اس طرح پینے کا پانی مہیا ہو جاتا تھا اور راز کی باتیں کوئی سن بھی نہ سکتا تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں ایک الماری بنی ہوئی تھی جہاں پر کچھ کتابیں حوالوں کے لئے ہر وقت رکھی رہا کرتی تھیں۔ کچھ مختلف چھوٹے اور بڑے مرتبان بھی تھے جن میں صحائف کو گول تہہ کر کے رکھا جاتا

تھا۔[1]

قمران کی دوسری نمایاں خصوصیت ایسینیوں کا بڑا قبرستان ہے۔ یہ مرکز کے مشرق میں دور تک چلا گیا ہے۔ اب بھی وہاں پر ایک ہزار قبریں ملی ہیں۔ یہاں بھی ایسینیوں کی نفاست اور باضابطگی کا ثبوت ملتا ہے۔ سب قبریں برابر اور انتہائی باقاعدگی سے بنی ہوئی ہیں۔ قبروں کی کھدائی پُر عجیب و غریب انکشافات ہوئے ہیں۔ پرانے زمانے میں بحیرہ روم کے آس پاس کے علاقہ میں یہودی۔ لامذہب اور عیسائی عام طور پر اپنے مردہ لوگوں کے ہمراہ مختلف قسم کی چیزیں مثلاً زیورات۔ اوزار۔ ہتھیار۔ برتن۔ چراغ وغیرہ دفن کیا کرتے تھے تاکہ اُن کو لوگوں کے خیال کے مطابق وہ اشیا دوسری دنیا میں اُن کے کام آسکیں ایسینی کوئی چیز اپنے مُردوں کے ساتھ دفن نہیں کرتے تھے۔ ہم اس سے اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ یہ خدا کے سچے اور نیک بندے دنیا اور آخرت میں ذاتی ملکیت کا تصور ہی نہیں رکھتے تھے۔ اس محقق کا بیان ہے کہ میرے رہنما نے شمال اور جنوب میں دو اور قبرستان دریافت کئے ہیں۔ یہ دونوں چھوٹے ہیں۔ ان میں عورتوں کی قبریں پائی گئی ہیں۔ کچھ قبروں سے کانوں کی بالیاں اور موتیوں کے ہار ڈھانچوں کے ساتھ رکھے ملے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قمران کی عورتیں مردوں کے مقابلہ میں تارک الدنیا اور سادہ نہ تھیں۔ مشہور مؤرخ جوزیفس کے قول کے مطابق تمام ایسینی غیر شادی شدہ نہیں ہوتے تھے وہ لکھتا ہے کہ ایسینیوں میں اور مذاہب کے لوگ بھی شامل تھے۔ اُن لوگوں میں اور دوسرے لوگوں میں..... کوئی خاص وجہ امتیاز نہ تھی۔ البتہ ان کی رہائش۔ طور طریقے اور قانون اور خصوصی طور پر ازدواجی زندگی اور لوگوں سے مختلف تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اگر ازدواجی زندگی سے گریز کیا جائے تو وہ زندگی کے ایک اہم گوشے کٹ جاتے ہیں۔ آخر کار ازدواجی پر تو آئندہ نسل کا انحصار ہے بلکہ اُن میں بعض کا تو یہ خیال تھا کہ اگر سب لوگ اسی خیال کے ہو جائیں تو آئندہ نسل انسانی ختم ہو جائے گی۔ آثارِ قدیمہ کی شہادت سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ قمران میں عورتیں اور بچے موجود تھے۔ بہت سے علماء کا یہ خیال ہے کہ قمران میں عورتیں ضرور تھیں۔ مگر وہ مرکز کے خاص خاص حصّوں میں نہیں جا سکتی تھیں اور نہ

---

[1] ایک صحیفہ کا ترجمہ:۔ "جو لوگ عقل اور سمجھ رکھتے ہیں اور اُس سے کام لیتے ہیں ان کے لئے علم کا سرچشمہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے"۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے آثارِ قدیمہ کے ماہرین نے قمران کے قریب گیارہ عدد ایسے غاروں کا پتہ لگایا ہے جہاں پر صحائف پوشیدہ کئے گئے تھے۔ بعض صحائف بہت اچھی حالت میں برآمد ہوئے ہیں۔ جو بھی نمونے کتبوں اور نوشتوں کے ملے اور جن کا باضابطہ معائنہ ہو چکا ہے ان میں چھ سو قسم کے کتبوں اور نوشتوں کے نمونے ملے ہیں۔ ان میں بہت ہی پرانے یعنی عہد عتیق کے صحائف بھی شامل ہیں۔ یہ صحائف شروع میں مرکز میں تحریر ہوتے تھے اور بعد میں ان کی کئی کئی نقلیں کی جاتی تھیں۔ ایک عالم درمیان میں کھڑا ہو جاتا اور اس پاس بیٹھے ہوئے لوگوں کو صحائف تحریر کرانے جاتے تھے۔ قلم دوات کی تیاری و صفائی کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا تھا۔ کچھ علیحدہ بیٹھ کر صحائف کی نقل کرتے تھے۔ کوئی اہم بات ہوتی تو فوراً مشورہ ہوتا تھا۔ صحائف کے لکھنے سے پہلے اور بعد میں ہاتھ پاک صاف کئے جاتے تھے اور تحریر شدہ صحائف طاقوں میں رکھ دیئے جاتے تھے۔

کوئی مشورہ دے سکتی تھیں۔ بڑے تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ لوگ مکانوں یا عمارتوں میں نہیں رہتے تھے۔ بلکہ قرب وجوار کے غاروں یا چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں اور خیمہ وغیرہ لگاکر چاروں طرف رہا کرتے تھے۔ مرکز میں صرف کھانے کے وقت اور دیگر مذہبی معاملات یا فرائض کی ادائیگی کے لئے جمع ہوتے تھے۔

ماہرین نے ۱۹۵۸ء میں پھر سے کھدائی کا کام شروع کیا ہے اور "عین فشاخ" میں ایک بڑی عمارت کے کھنڈرات جس میں کبھی بہت سے گودام تھے معلوم کئے ہیں۔ "عین فشاخ" قمران سے دو میل جنوب میں واقع ہے۔ اس عمارت کی تاریخ و آثار قمران سے بالکل مشابہ ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ دونوں ایک ساتھ تعمیر ہوئے۔ اور دونوں ایک ہی وقت میں اُجڑے۔ یہاں کی شادابی اور سبزہ کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس علاقہ کو قمران کے باشندوں نے اپنا زرعی علاقہ بنایا تھا۔ عمارت کے قریب ہی ایک بڑا سا احاطہ ہے جس میں غالباً جانور رکھے جاتے تھے اور ایک شیڈ (SHED) پتھر کے ستونوں کا اب بھی موجود ہے۔ اس شیڈ کی چھت کو ایسینی کھجوریں سکھانے کے لئے بھی استعمال کرتے تھے۔ عمارت کے دوسری جانب ایک بڑا صحن ہے۔ جس میں بڑے بڑے کڑھاؤ اور ناندیں بنی ہوئی ہیں۔ اور ان کا تعلق ایک چھوٹی سی پانی کی نالی سے ہے۔ اس سے خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ صنعتی کاروبار میں استعمال ہوتی تھیں اور شاید کسی پرانی (TANNERY) چمڑے کی دباغت کے کارخانہ کا بقیہ حصہ ہیں۔

ایسینیوں کا یہ مرکز ہیرودے اعظم (HEROD THE GREAT) کے زمانے تک خوب کامیابی کے ساتھ جاری رہا۔ پھر جیسا کہ سکوں کی شہادت[1] سے پتہ چلتا ہے کہ یہ دونوں مقام کچھ عرصہ کے لئے غیر آباد ہو گئے تھے۔ قمران کی تاریخ میں خلا پایا جاتا ہے۔ بحر مُردہ کے کنارے بسے ہوئے اس مرکز کو ان لوگوں نے سیاسی دباؤ کی وجہ سے چھوڑا یا یروشلم کے مذہبی مخالفوں کے باعث۔ یہ بات ابھی پایۂ تصدیق تک نہیں پہنچی ہے۔ نہ ہی یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ہجرت ۳۱ سنہ قبل مسیح کے زلزلہ کی وجہ سے ہوئی۔ یا ان لوگوں کے چلے جانے کے بعد زلزلہ آیا اور نقصانات ہوئے بہرحال ان لوگوں کی تاریخ ایک نسل تک اندازاً (HEROD THE GREAT) کی سلطنت کے زمانے تک جو کہ ۳۷ سنہ قبل مسیح سے لے کر سنہ قبل مسیح تک تھا نہیں ملتی اور کہیں سے ملتی بھی ہے تو وہ غیر یقینی ہے۔

البتہ ایک شہادت ان واقعات پر اور اُس زمانے کے حالات پر روشنی ڈالتی ہے جس کے معنی و مطالب ابھی تک واضح نہیں ہوئے۔ یہ شہادت (RADOKITE DACUMENT) کہلاتی ہے۔ محض اتفاقی طور پر قاہرہ میں عرصہ ساٹھ سال ہوئے جبکہ ایک مقبرہ کے کمرے کو صاف کیا جارہا تھا، ایک تابوت ملا۔ اس تابوت میں کچھ صحیفے بھی

---

[1] قمران اور عین فشاخ کی کھدائی کے وقت بہت سے سکے بھی ملے ہیں جو اُس زمانے کے حالات معلوم کرنے میں بہت ممد و معاون ثابت ہوئے ہیں۔

رکھے ہوئے مل گئے۔ ان میں سے ایک صحیفہ جو کہ (ZADOKITE DOCUMENT یا DAMASCUS DOCUMENT) کہلاتا تھا۔ محض اتفاقی طور پر ہاتھ لگ گیا۔ یہ صحیفہ ناتمام چھوڑ دیا گیا تھا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایسینوں کے زمانے کے ایک ہزار سال بعد لکھا گیا۔ بہت عرصہ تک لوگ اس کے معانی و مطالب اور غیر معروف حوالوں کو سمجھنے میں سرگرداں رہے۔ لیکن علم کی ترقی کے ساتھ آج کے علماء اس نتیجہ پر پہنچ چکے ہیں کہ یہ ZADOKITE DOCUMENT) ایسینوں کی "الکتاب" کی ایک نقل ہے۔ اس کا ثبوت قمران کے غاروں سے بھی ملتا ہے کیونکہ وہاں سے بھی ایسی کتاب کے باقی اور اجزاء ملے ہیں۔ قاہرہ میں پائے ہوئے صحائف سے معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح یہ لوگ اپنے امیر یا پیشوا کے حکم سے جو کہ ان میں "قطب" کہلاتا تھا۔ جوڈیا (JUDAEA) کے صحرا سے نکل کر سرزمین دمشق میں آباد ہوئے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہجرت ہیرودے اعظم (HEROD THE GREAT) کے زمانے میں ہوئی۔ اس سے قبل ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ ان کے ایک بڑے گروہ نے بحر مُردہ کے کنارے والے مستقر کو کچھ عرصہ کے لئے چھوڑ دیا تھا۔ لیکن حال ہی میں چند علماء نے اس نظریہ سے اس پر اتفاق نہیں کیا کہ (ZADOKITE DOCUMENT) کی نقل جو کہ بحر مُردہ کے کنارے دستیاب ہوئی ہے وہ ۳۷ سنہ قبل مسیح کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "سرزمین دمشق" دراصل ایسینوں کی اصطلاح میں وہ خطۂ زمین ہے۔ جہاں پر یہ لوگ اسرائیلیوں کے علاقہ (JUDAEA) سے ہجرت کر کے آئے تھے۔ اگر یہ بات صحیح مان لی جائے تو پھر ان کی یہ عارضی ہجرت ایک نامعلوم مقام کی جانب ناقابل حل معمہ بن جاتی ہے۔ بہرحال ہیرودؔ کی وفات کے فوراً بعد ہم ایسینوں کو اپنی بستیوں میں مصروف پاتے ہیں۔ کہیں مکانات کی مرمت ہو رہی ہے۔ کہیں سامان کی دیکھ بھال صرف اس سہارے و اُمید پر کہ اب وہ مسیحا آنے والا ہے جس کا وعدہ موسیٰ و ہارون نے کیا تھا۔ لیکن خواہشات اور آرزوؤں سے تقدیریں تو بدلا نہیں کرتیں۔ ان کے لئے کوئی "مسیحا" نہ آیا بلکہ تباہی اور مصیبت آئی اور یہ لوگ پھر منتشر ہو گئے اور اس مرتبہ غالباً ہمیشہ کے لئے۔ (JUDAEA) کے سیاسی حالات میں بڑا تغیر ہوا۔ حضرت عیسےٰؑ کی آمد کا زمانہ قریب آ رہا تھا۔ حالات دن بدن خراب سے خراب تر ہوتے جا رہے تھے۔

آخر کار ۶۶ سنہ میں تمام یہودی اپنے رومی آقاؤں کے خلاف خوں ریز بغاوت پر آمادہ ہو گئے تھے۔ زمین کے کسی کونے میں امن نہ تھا۔ یہاں تک کہ صحرا جوڈیا میں بھی امن مفقود ہو گیا۔ قمران کے باشندوں نے حالات کا صحیح اندازہ لگایا اور ہر قربانی اور مصیبت کے لئے آمادہ نظر آنے لگے۔ وہ قیمتی صحائف جن میں مدت دراز کی پیشینگوئیاں تھیں اور جن کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ یہ آئندہ دنیا میں ان کے کام آئیں گی۔ تمام دستاویزات اور سب متعلقہ اشیا کو انھوں نے غار میں چھپا دیا۔[1]

---

[1] صحیفہ کے الفاظ "سرچشمہ علم پوشیدہ کر دیا گیا" یہ الفاظ اب سے دو ہزار سال قبل بحر مُردہ کے کنارے گونجے تھے جبکہ (ESSENES) ایسینی اپنے آخری ایام میں صحائف کو غاروں میں چھپا رہے تھے کوئی سو برس قبل مسیح یہ لوگ رومیوں اور دیگر مذہبی اجارہ داروں کی سختیوں سے تنگ آ کر وادی قمران میں پناہ گزیں ہوئے تھے۔ یہ لوگ ایک نئے مسیحا کی آمد کے منتظر تھے۔

شاید اُن کے دلوں میں یہ خیالات موجزن ہوں کہ یہ فساد بحر وبر اور افراتفری جو کہ ہر جگہ نمایاں تھی اس بات کی علامت تھی کہ اب روزِ جزا کے آنے میں دیر نہیں ہے۔

ان لوگوں نے کچھ صحائف کو کپڑوں میں لپیٹ کر بڑے بڑے لمبوترے قسم کے مرتبانوں میں جو کہ اس زمانے میں عام طور پر اس قسم کی چیزوں کے جمع کرنے کے لئے استعمال ہوتے تھے اور ان کو پیالہ نما ڈھکنوں سے سربمہر کر دیا۔[1]

حالات اس قدر تیزی سے بگڑ رہے تھے کہ وہ ہر صحیفے کو محفوظ بھی نہیں کرسکتے تھے۔ مجبوراً انھوں نے غاروں کے فرش پر ڈھیر لگا دیا۔ خیال تھا جلد ہی یہ افراتفری ختم ہو جائے گی اور یہ واپس آ کر ان کو سنبھال لیں گے۔ مگر ایسا نہ ہوسکا۔ امتدادِ زمانہ۔ چوہے کیڑے اور دیمک کی دستبرد سے یہ صحائف کس طرح بچ سکتے تھے۔ کوئی صحیفہ ثابت نہ بچا۔ اب صرف چند ٹکڑے ہاتھ لگے ہیں۔ جن کو یکجا کرنے اور اپنے اپنے مقام پر بٹھانے کی کوشش میں علماء لگے ہوئے ہیں۔

جیسا کہ شروع میں بتایا جاچکا ہے ایسینوں نے غار نمبر ۳ میں کچھ صحائف تانبے کے پتروں پر لکھے ہوئے بھی چھوڑے تھے۔ ابتداً یہ تانبے کے پتر آپس میں جڑے ہوئے تھے۔ ان کی لمبائی آٹھ فٹ اور چوڑائی ایک فٹ کے قریب تھی ماہرین اور علماء کو بڑی ناامیدی ہوئی جبکہ انھوں نے محسوس کیا کہ صدیوں پرانے ان تانبے کے پتروں کو جو کہ زنگ خوردہ اور امتدادِ زمانہ سے بہت ہی خستہ ہوگئے تھے۔ کس طرح کھولا اور عبرانی میں تحریر شدہ صحائف کو کس طرح پڑھا جائے؟ یہ واقعی ایک اہم اور مشکل مسئلہ بن گیا۔

امریکہ کی ایک مشہور یونیورسٹی نے اس مسئلہ کو حل کرنے کا تہیہ کیا۔ اُس کے سائنسدانوں نے تانبے کے ٹکڑوں کے اصلی اجزاء معلوم کئے۔ پھر انھوں نے ایک نیا پتر ان ہی اجزاء پر مشتمل اپنی لیبارٹری میں بنایا۔ اور اس کو اسی طرح تہہ کر دیا۔ جس طرح اصلی ٹکڑے تہہ ہوئے تھے۔ انھوں نے اس ٹکڑے پر نقلی (OXIDZAFION) کا عمل کیا اور اس طرح اس ٹکڑے کو اصلی پتروں کی حالت میں پہونچایا۔ مختلف اور متعدد تجربات کے بعد یونیورسٹی کے سائنسدانوں نے ایک ایسا طریقہ جس سے وہ تانبے کے پتر اپنی اصلی حالت پر لائے جاسکتے تھے دریافت کرلیا۔ اسی اثنا میں انگلستان کی ایک یونیورسٹی کے فنی کالج کے سائنسداں تانبے کے پتروں کو کھولنے میں کامیاب ہوگئے۔ اس سخت مشکل اور اہم کام میں ایک پروفیسر نے ایک نیا طریقہ ایجاد کیا اور ایک مشین بنائی جس کے ذریعہ انچ کے ہزارویں حصہ پر لکھی ہوئی عبارت بھی پڑھی جاسکتی تھی اور لطف یہ ہے کہ سارا کام اس حسن وخوبی سے سرانجام پذیر ہوا کہ پتروں کا ایک لفظ تو درکنار ایک نقطہ بھی ضائع نہ ہوا۔[2]

---

[1] تو نے مجھے پہونچا دیا ایک مضبوط قلعے میں جس کی دیواریں اونچی ہیں۔"

[2] تانبے کے پتروں پر لکھے ہوئے صحائف گول مڑے ہوئے تھے اور اس قدر خستہ اور نازک ہوگئے تھے کہ ان کا کھولنا تو کجا ہاتھ کی ذراسی ٹھیس ان کو ریزہ ریزہ کرنے کیلئے کافی تھی۔ بہت عرصہ تک یہ قیمتی ٹکڑے ناقابل فہم رہے اور قطعی پڑھے نہ جاسکتے تھے آخرکار ماہرین اور سائنسدانوں نے اس مشکل کا حل تلاش کر ہی لیا اور جب یہ کھولے گئے تو چھپے ہوئے خزانوں کا پتہ تحریر شدہ ملا۔ آخرکار ایک انگریز ماہر نے ان تمام صحائف کو نہ صرف پڑھ لیا بلکہ تمام پتروں کو کھول بھی لیا۔

یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر کار یہ تمام تگ و دو اور کاوش کس کے لئے کی گئی؟ تانبے کے پتروں پر آخر کیا لکھا تھا؟ دراصل یہ خزانہ تلاش کرنے والوں اور آثار قدیمہ کے ماہرین کے لئے ایک بڑا ضروری پیغام تھا۔ اس میں قریب قریب ساٹھ ایسے مقامات کا تذکرہ ہے جہاں یہ کثیر تعداد میں سونے اور چاندی کے خزانے کی جانب راہ نمائی کی گئی ہے۔ مغربی اردن میں (HERON TO NABLAS) تک یہ خزانے مخفی ہیں۔ مثلاً ایک خزانے کا پتہ اس طرح دیا ہوا ہے۔

"قلعہ کی مشرقی دیوار کے نیچے پہاڑی کے ایک کونے میں جو کہ کھدا ہوا ہے۔ چھ سو چاندی کے ٹکڑے رکھے ہوئے ہیں"۔ یا مثلاً "(ZADOK) کے مقبرہ کے قریب جنوبی کونے میں نیچے راستہ پر بڑے مکرے کے کھمبے کے نیچے ایک بہت بڑا گہرا گڑھا ہے جس میں لوبان اور دیگر خوشبودار لکڑیاں ہیں"۔ "قریب ہی ایک گڑھے میں قلعہ سے شمال کی جانب جو کہ قبرستان کے شمالی حصہ میں نکلتا ہے۔ اس میں اس کتبہ کی نقل۔ مزید تفصیلات۔ پیمانے اور شرحیں ہیں"۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا واقعی یہ خزانوں کی فہرست ہے یا یہ بھی ایسینی کتبوں کی طرح ایک کتبہ ہے جس کا مطلب ابھی تک سمجھ میں نہیں آیا۔ زیادہ تر علماء کا خیال ہے کہ ہم ابھی تک اس کتبہ کو نہیں سمجھے ہیں۔ لیکن ایک بات یقینی ہے کہ اگر واقعی کہیں خزانہ مدفون ہے تو ایک نہ ایک دن بینہ تھکنے والے بدو ضرور اس کو تلاش کر لیں گے۔

ایسینیوں کا آگے کیا حشر ہوا۔ صحیح حالات تو ابھی تک معلوم نہیں ہو سکے۔ رومی جنرل ویسپیسین (VESPASIN) کی فوجوں نے اُن کے مرکز یعنی قمران پر ۶۸ء میں قبضہ کر لیا تھا۔ گمان غالب ہے کہ یہ لوگ لڑتے لڑتے مر گئے۔ یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ رومیوں نے جذبۂ انتقام سے مجبور ہو کر ان کو ختم کر دیا ہو۔ اور ان دین کے سچے حضرت موسیٰ کے سچے نام لیواؤں کو نیست و نابود کر دیا ہو۔ یا ممکن ہے کہ وہ اپنی جان بچا کر اس علاقے سے نکل گئے ہوں اور اس طرح زمانے کی نظروں سے غائب ہو گئے ہوں۔ مرکز کے سقوط کے بعد کچھ عرصہ تک رومیوں نے یہاں اپنا فوجی دستہ رکھا۔ اس کے بعد رومیوں نے بھی قمران کو چھوڑ دیا۔

عرصہ گذرنے کے بعد ۱۳۵-۱۳۲ء میں یہودیوں نے دوبارہ مگر زیادہ منظم طریقہ سے رومیوں کے خلاف بغاوت کی۔ تیرکوہ قبا کے باغیوں کے ایک گروہ نے پھر اس مرکز کو آباد کیا لیکن ان کو بھی یہ علاقہ راس نہ آیا۔ اس وقت سے لے کر آج تک یہ جگہ ویران ہے۔ لیکن اس کے اصلی مکین یعنی ایسینی (ESSENES) نہ تو بھلائے گئے اور نہ ہی بھلائے جا سکتے ہیں۔ چمڑے[1] کے ٹکڑے اور دیگر نشانیاں

---

[1] غار نمبر ایک سے ایک عظیم صحیفہ (ISAIAH) کے بارے میں سب سے اچھی حالت میں ملا ہے۔ یہ صحیفہ چمڑے پر لکھا ہوا ہے اور اس میں پورے ۶۶ ابواب (BOOK OF ISAIAH) ہیں۔ عبرانی خط کی طرز تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صحائف سو سال قبل مسیح تحریر ہوئے تھے ایڈیٹر کا خط اور کاتب کا خط بالکل نمایاں ہے کہیں کہیں بین السطور اضافے بھی ہیں۔ ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ (ISAIAH) نبی جو کہ آنے والے مسیحا کی پیشینگوئیاں بہت زیادہ کرتے تھے۔ ایسینیوں کی جماعت میں بہت پسندیدہ اور ہر دلعزیز تھے۔

جو کہ وقتاً فوقتاً فلسطین کے آثار قدیمہ کے محکمے میں جمع ہوتی رہتی ہیں وہ ان کی یاد کو تازہ رکھتی ہیں اور ان کی عظمتِ رفتہ و دینی خدمت کو نمایاں کر کے تاریخ میں ایک اہم مقام ان کے لئے وقف ہو چکا ہے۔

غار نمبر ۴ اور اس میں سے دریافت شدہ سینکڑوں صحائف کے ٹکڑوں نے بین الاقوامی ماہرین کو یروشلم میں جمع ہونے کے لئے آمادہ کر لیا ہے۔ انھوں نے پھر سے قمران میں اور گرد و نواح میں پائے ہوئے صحائف کے ٹکڑوں کو جمع کرنے اور شائع کرنے کا عزم کیا ہے۔ یہ ماہرین فرانس، پولینڈ، جرمنی، برطانیہ اور امریکہ سے جمع ہوئے ہیں اور اردن کے آثار قدیمہ کے سربراہ کے تحت کام میں مصروف ہیں۔ ان ماہرین نے ایک خاص مہارت ان تباہ شدہ اور خراب و خستہ ٹکڑوں کو ایک جا جمع کرنے اور ان کے مختلف خطوں اور تحریروں کو پہچاننے کی مہارت بدرجہ اتم پیدا کر لی ہے۔ یہ ٹکڑے کو دیکھتے ہی بتلا دیتے ہیں کہ یہ کس صحیفہ سے متعلق ہے اور کس کاتب نے لکھا ہے۔

ٹکڑوں کو جمع کرنے اور ان کو پڑھنے کا طریقہ بھی عجیب ہے۔ ایک سیاح کا بیان ہے کہ میں ایک دن اس بڑے ہال میں جہاں یہ ٹکڑے جمع کر کے رکھے جاتے ہیں گیا وہاں ایک شخص سے جو ٹکڑوں کو دیکھ رہا تھا گفتگو شروع کی۔ قریب ہی ایک ڈھیر ٹکڑوں کا پڑا ہوا تھا۔ یوں ہی اس نے ایک ڈاک کے ٹکٹ سے بھی چھوٹے ٹکڑے کو اٹھایا۔ ذرا گہری نظر سے دیکھا اور یہ کہتے ہوئے کہ ذرا معاف کریں میں ابھی آتا ہوں، لے جا کر اس ٹکڑے کو کمرے کے دوسرے سرے پر ایک طشت میں جا کر جما دیا[1] وہ وہاں ٹھیک بیٹھا۔ میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ میرے تعجب و حیرانی کی انتہا نہ رہی۔ ان لوگوں کا انہماک واقعی قابل داد ہے۔ پھر آ کر گفتگو مجھ سے اسی بے تکلفی سے شروع کر دی۔ امریکہ اور اردن کے باہمی اشتراک سے آثار قدیمہ کے ماہرین کی کوششیں اور تیز ہو گئیں۔ ان لوگوں کی انتھک کوششوں اور معاملہ فہمی نے یہ بات آسان کر دی ہے کہ قمران یا اس پاس کے غاروں سے جو چیز بھی برآمد ہو وہ یروشلم باقاعدگی سے پہنچ جائے۔ یہ کام ایک موچی کے ذریعہ انجام پاتا ہے۔ بدوؤں کو جو کچھ ہاتھ لگتا ہے وہ اس کو لا کر دیتے ہیں اور وہ اس کو ان ماہرین تک پہنچا دیتا ہے۔ چمڑے کے ایک مربع انچ کے ٹکڑے کی قیمت تقریباً سو روپیہ ہوتی ہے۔ میوزیم سے قیمت وصول کر کے وہ بدوؤں کو اپنا کمیشن کاٹ کر رقم ادا کر دیتا ہے۔ کچھ رقم صرف اس لئے روک لی جاتی ہے تاکہ دوسرے ٹکڑوں کی آمد میں تاخیر نہ ہو۔ دوسرے موقع پر پہلی رقم ادا کر دی جاتی ہے۔ اس طرح بدوؤں کو جو کچھ بھی ملتا ہے وہ لا کر دیتے ہیں تاکہ وہ اپنے پہلے مال کی قیمت بھی وصول کر لیں۔ اگر کسی وجہ سے بدوؤں کو وقت پر قیمت ادا نہ کی جائے یا ان کو مزدوری نہ ملے تو وہ نعل بدآتش ہو جاتے ہیں اور اگر ان کو یہ معلوم

---

[1] فلسطین کے مشہور آثار قدیمہ کے دفتر میں پانچ اقوام عالم کے ماہرین جمع ہیں۔ ہر زبان، خط اور مضمون کے لحاظ سے صحائف کو الگ الگ رکھا گیا ہے۔ یہ ماہرین بڑی محنت اور جانفشانی سے ایک ایک ٹکڑے کو جانچتے اور دیکھتے ہیں اور بعد تحقیق اسکو اس کے اصلی مقام پر پہنچا دیتے ہیں اور اپنی جانب سے کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھتے۔

ہو جائے کہ جان بوجھ کر دیر کی جا رہی ہے تو وہ اپنے خنجر کو استعمال کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں کرتے۔

اس طریق تجارت سے یروشلم کے میوزیم میں کافی قیمتی ذخیرہ جمع ہو گیا ہے۔ پہلے یہ طریق تجارت باضابطہ نہ تھا۔ دونوں فریق یعنی موچی اور بدو حکومت سے خوفزدہ رہتے تھے۔ معاملہ کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے حکومت نے خصوصی طور پر اس تجارت کی اجازت دیدی ہے۔

کوشش تو یہی کی جاتی ہے کہ تمام صحیفوں کے ٹکڑے یروشلم میں پہنچیں مگر انتہائی احتیاط کے باوجود یہ دوسری جگہ پہونچ جاتے ہیں۔ کچھ لوگ ناجائز طور پر باہر لے جاتے ہیں اور کچھ سیاحوں کے ذریعہ نادانستہ طور پر باہر چلے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ اردن کے بہت سے تاجر خواہ مخواہ دخل در معقولات کے لئے آمادہ رہتے ہیں۔ وہ لوگ بعض اوقات ایسی چیزیں فروخت کرنا چاہتے ہیں جن کا وجود ہی نہیں ہوتا۔ اور اگر ہوتا بھی ہے تو دور دراز مقام پر۔ غالباً ان کا نظریہ اس بارے میں یہ ہے کہ پہلے گاہک پیدا کیا جائے مال خود بخود فراہم ہو جائے گا۔

اس سیاح کا بیان ہے کہ یروشلم میں ایک دن ایک شخص میرے پاس بڑے ہیر پھیر سے آیا۔ کہنے لگا کہ اس کو ایک ایسے آدمی کا علم ہے جس کے پاس ایک مکمل صحیفہ برائے فروخت ہے۔ آخر کار بڑی تلاش کے بعد اس آدمی کا پتہ چلا۔ معلوم ہوا کہ وہ اردن کی پارلیمنٹ کا ممبر ہے اور عمان میں مقیم ہے۔ افواہیں چونکہ گرم تھیں کہ ایک غار سے کچھ صحیفے نکلے ہیں اور وہ چوری چھپے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں جا رہے ہیں۔ اس معاملہ کی تہ تک پہنچنا ضروری تھا۔ میں نے اپنے رہنما کے ساتھ عمان جانے کی ٹھانی وہاں پہونچ کر معلوم ہوا کہ جس صحیفہ کا تذکرہ اس زور و شور سے ہو رہا ہے۔ وہ ایک تازہ نسخہ تھا جو کہ ۱۹۴۸ء کی جنگ میں ایک تابوت سے برآمد ہوا تھا۔ کچھ بھی ہو۔ قہوے خانوں میں اب بھی افواہیں۔ پیش کشیں۔ اور برائے نام دعووں کا تذکرہ رہتا ہے۔ اور ہر افواہ کا پتہ لگانا پڑتا ہے۔ چاہے آخر میں ناکامی ہی کیوں نہ ہو۔

تازہ ترین دریافت غار نمبر ۱ سے ہوئی ہے۔ سب اشیاء میوزیم میں پہنچا دی گئی ہیں (LEVIFICUS) کے زمانے کے بالکل اچھی حالت میں صحائف دریافت ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ دعاؤں کی کتاب صحیفہ ایوب (BOOK OF JOB) کا ترجمہ آرامی زبان میں اور اس دور کے لئے یروشلم کا نامکمل بیان۔ باوجود ان حاصل شدہ صحائف کے ابھی تک قریباً ڈھائی لاکھ ڈالر کے مختلف صحائف بدوؤں کے ہاتھوں میں ہیں۔

اس عرصہ میں ماہرین نے اپنی خاموش جدوجہد صحائف کے پڑھنے میں صرف کر رکھی ہے۔ جوں ہی کوئی نئی بات معلوم ہوتی ہے وہ پریس میں آ جاتی ہے اور تمام دنیائے ماہرین و علماء اس پر غور و فکر کرتے ہیں اور معانی و مطالب کے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دس سال سے زیادہ عرصہ اور ممکن ہے کہ ایک پوری نسل کا عرصہ ان صحائف کی پوری قدر و قیمت جاننے میں لگ جائے۔ لیکن اس وقت بھی بائبل کے علم میں جو کمی یا خلا پایا جاتا ہے اور بے لبھی ہے۔ وہ ان صحائف کی رُو سے بڑی حد تک دور ہو گئی ہے۔ مثلاً (ان محققین کا کہنا ہے) کہ اب ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ عبرانی میں موجودہ

عہدنامہ عتیق کا جو متن ہے۔ وہ حضرت عیسیٰؑ سے بھی پہلے کی روایات پر مبنی ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ صرف موجودہ متن ہی نہیں بلکہ کئی اور متن بھی عہدنامہ عتیق کے تھے[1] اور کچھ اختلافات کے ساتھ موجود تھے۔ امتدادِ زمانہ سے دوسرے متن ختم ہو گئے۔ اب اُن کے حوالے اور اقتباسات پُرانے زمانے کی کتابوں میں ملتے ہیں کیونکہ یہ صحائف یہودیوں اور رومیوں کے تصادم کے دوران غائب ہو چکے تھے۔ انجیل کے عالم کے لئے یہ اختلافات اور مختلف روایات بہت اہم درجہ رکھتی ہیں کیونکہ ان روایات میں عہدنامہ عتیق کے حوالے زیادہ صحیح اور مسلّمہ ہیں۔ مقابلۃً اُن حوالوں اور روایات کے جو پرانے یہودی علماء کے پاس تھیں۔ یہ تمام متن موجودہ یہودیت اور عیسائیت پر اثر انداز ہوتے ہیں یا نہیں یہ تو آئندہ زمانہ بتائے گا۔ دوسری جانب السینیوں اور پُرانے عیسائیوں میں بہت سے عقائد و اعمال مشترک ملتے ہیں۔ دونوں یہ خیال رکھتے تھے کہ اس دنیا کا خاتمہ قریب ہے اور اس ناگاہ حادثہ کی تیاری میں لگے رہتے تھے۔ یہ دونوں ایسی زندگی گذارنا پسند کرتے تھے جو انھیں گناہوں سے پاک اور بَری کردے اور ان میں ایسی پاکیزگی پیدا کردے جو کہ ابتدائی بپتسمہ کے وقت ضروری سمجھی جاتی تھی۔ دونوں گروہ مقدس کھانے میں شرکت کرتے تھے۔ اس میں نان اور شراب استعمال ہوتی تھی۔ دونوں اجتماعی ملکیت کے قائل تھے۔ ذاتی ملکیت کو گناہ سمجھا جاتا تھا۔ دونوں ایک ساتھ عبادت کرتے تھے۔ ایک ساتھ دعائیں مانگتے تھے۔ ساتھ دعائیں گاتے تھے۔ دونوں صحائف کے معنی و مطالب پر ساتھ غور کرتے اور سمجھتے تھے۔ دونوں اپنے اپنے بزرگوں اور بانیان کی یاد تازہ رکھتے تھے۔ اور نہایت عمدگی اور ہوشیاری سے ایسا لٹریچر تیار کرتے تھے جو ان دونوں کے عقائد و خیالات پر مشتمل ہو۔ دونوں اپنے آپ کو سچے اسرائیلی کہلاتے تھے یعنی نئے عہدنامہ کی حامل ایک جماعت۔ دونوں مظلوم اقلیتیں تھیں۔ دونوں تجرّد کی زندگی کو ازدواجی زندگی پر ترجیح دیتے تھے۔ تمام ادیان کے علماء ان مشابہات کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ کیونکہ یہ واقعات ہیں۔ لیکن برخلاف اُن چند مبالغہ آمیز تاویلات کے علماء کا یہ خیال ہرگز نہیں کہ موجودہ عیسائیت ایک کامیاب (ESSENISM) ہے۔ ان دونوں گروہوں کے متوازی عقائد کے وجوہات ظاہر ہیں۔ دورِ اولیں کے عیسائی اپنے آپ کو (JUDAISM) کے اندر ایک فرقہ خیال کرتے تھے اور

---

[1] آج بھی طامرہ کے بدو اُن قدیم وادیوں اور میدانوں میں اپنی بکریاں اور بھیڑیں چراتے ہوئے ملتے ہیں۔ یہ مزید غاروں کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں جہاں سے صحیفے نکل آئیں۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ قمران کی لائبریری کے کچھ حصے ۱۹۴۷ء سے قبل بھی دریافت ہو چکے ہیں (ORIGEN) جو تیسری صدی کا ایک مشہور و معروف عیسائی مذہبی عالم ہے۔ اُس نے بیان کیا ہے کہ (JERICHO) کے نزدیک ایک مرتبان میں عبرانی زبان میں لکھی ہوئی ایک کتاب ملی۔ اور اسی طرح کی ایک دریافت کا ذکر (TIMOTHEUS) نے اپنے ایک خط میں اس کتاب کے بارے میں کیا ہے جو کہ اسکو سنہ ۸۰۰ء کے قریب جیریکو (JERICHO) کے نزدیک ایک غار سے دستیاب ہوئی تھی۔

اسی لئے یہ یہودیوں کے ورثہ میں برابر کے شریک تھے۔ عبرانی کی بائبل کا ورد ہوتا تھا اور حضرت عیسیٰؑ کے درود اور کردار کا جائزہ پچھلی روایات کی روشنی میں لیتے تھے اور بالکل اسی طرح اول دور کے عیسائیوں کی جمعیت ان تمام افکار و اقوال کی جو پہلی صدی میں (JUDAEA) میں رائج تھے پیروی کرتے تھے۔ مختصراً یہ ہے کہ بہت کم مذہبی علماء نے عیسائیت کو اس نقطۂ نظر سے کبھی انوکھا (UNIQUE) نہیں خیال کیا کہ اُس کا تعلق اس کے پچھلے پیشروؤں سے قطعی نہیں ہے یا وہ ماضی سے بالکل کٹ گئے ہیں یا اُن کا تعلق یہودی فکر سے بالکل نہیں رہا۔ یا وہ ان کے طور طریقہ اور زندگی کو پسند نہیں کرتے۔ حضرت عیسیٰؑ نے ماضی سے اور ماضی کی تعلیمات سے قطعی تعلق منقطع نہیں کیا۔ انھوں نے تو بارہا یہی کہا کہ میں پرانے نبیوں کی شریعت سے انحراف کرنے نہیں بلکہ اُن کے سلسلہ اور تعلیمات کو زندہ کرنے کے لئے آیا ہوں۔ قانون کو ختم کرنے کے لئے نہیں بلکہ اُس کی تکمیل کے لئے مبعوث ہوا ہوں۔

بحرِ مُردہ کے کنارے پائے ہوئے صحائف ہم کو اُس دور کی مذہبی فضا کو جس میں حضرت عیسیٰؑ پیدا ہوئے سمجھنے کے لئے ایک نیا زاویہ نگاہ پیش کرتے ہیں۔ ان سے ایک نئی بات معلوم ہوتی ہے اور اُن خصوصی یہودی اثرات کا پتہ چلتا ہے۔ جو کہ عیسائیت کی ارتقا میں ممد و معاون ثابت ہوئے اور پہلی مرتبہ ایسینی (ESSENES) جو کہ عرصہ دراز سے عجوبہ بنے ہوئے تھے اب بالکل نکھر کر اور اُبھر کر سامنے آ گئے ہیں۔ اُن کی روحانی کشمکش کی کہانی ازمنہ وسطیٰ کی تاریکیوں سے نکل کر ایک مسحور کن گیت کی شکل میں سامنے آ جاتی ہے۔

قمران اپنے شاندار اور پُر عظمت ماضی کے باوجود امتدادِ زمانہ کے ہاتھوں آج پامال ہے۔ اب صرف کھنڈر ہی کھنڈر ہیں اور آس پاس بھی زندگی کے آثار مفقود ہیں۔ واقعی غور و فکر کرنے والے کے لئے بڑی عبرت کا مقام ہے۔ اب اس شوریلے سمندر کے کنارے کی زمین میں کچھ پیدا نہیں ہوتا۔ اب کوئی ان پرانے کھنڈرات میں چلنے پھرنے والا بھی نہیں۔ آسمان کی آنکھیں پھر سے بحرِ مُردہ کے کنارے کو تک رہی ہیں۔ اور ہوا آج بھی سائیں سائیں کرتی ہوئی قمران کی دیواروں میں سے کسی کو تلاش کرتی ہوئی گذرتی ہے۔ کچھ بھی ہو کسی زمانے میں یہاں پر لوگوں نے خدا اور اُس کے قانون کو معلوم کرنے کی کوشش کی تھی۔

نہایت ضروری

خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے۔ ورنہ عدمِ تعمیل کی شکایت معاف

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام۔ لاہور

جشنِ عیدِ میلاد النبیؐ کی تقریب

پر

اِدارہ طلوعِ اسلام

کا

گراں بہا تحفہ

معراجِ انسانیت

(سیرتِ نبی اکرمؐ قرآن کریم کے آئینہ میں)

بیس روپے ۲۰/-

کی بجائے

پندرہ روپے ۱۵/-

فرمائش بھیجنے میں دیر نہ کیجئے

رابطۂ باہمی

بزمیں متوجہ ہوں

مجوزہ آئین کے سلسلہ میں ادارہ کی طرف سے جو لٹریچر شائع ہو، اس کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کی ضرورت ہے۔ لہٰذا تمام بزموں سے درخواست ہے کہ وہ اس مقصد کے لئے اپنی کوششوں کا حلقہ وسیع تر کر دیں۔

اس ماہ "اسلامک آئیڈیالوجی" کے عنوان سے دو پمفلٹ شائع ہوئے ہیں۔ ایک اردو میں اور دوسرا انگریزی میں۔ ان کی عام اشاعت کی ضرورت ہے۔ بالخصوص انگریزی کے پمفلٹ کی۔ تاکہ قرآنی پیغام انگریزی خواں طبقہ تک بھی پہنچ جائے۔ (ان پمفلٹوں کی قیمت چار چار آنے ہے)

(۲) بہتر ہو کہ بزمیں ادارہ کو (مستقلاً) لکھ دیں کہ اس قسم کے پمفلٹوں کی کتنی تعداد انھیں (بلا طلب) بھیج دی جایا کرے۔ اس سے خط و کتابت کی زحمت اور وقت بچ جائے گا۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام

ماہانہ رپورٹیں

کراچی

بزم کے ہفتہ وار اجلاس بی ایم اے بلڈنگ ڈنبل روڈ کے ہال میں باقاعدگی سے ہو رہے ہیں حالیہ اجلاس میں پونڈا باندی کے باوجود حاضری دو صد کے قریب تھی۔ پرویز صاحب کی "اسلام اور کمیونزم" کے موضوع پر ٹیپ ریکارڈ تقریر کو بے حد سراہا گیا۔ مجلس کے اختتام پر اردو اور انگریزی

پمفلٹ تقسیم کئے گئے۔ ضرورت مند احباب ادارہ طلوع اسلام کے ہر قسم کے لٹریچر کے لئے نیشنل فارمیسی۔ ۳۴۔ موتن بلڈنگ۔ بندر روڈ (نزد میمن مسجد ــــ بولٹن مارکیٹ) کی طرف رجوع فرمائیں)

پرویز صاحب کی کراچی میں آمد کے سلسلے میں تیاریاں شروع ہیں۔ پروگرام کو آخری شکل دیدی گئی ہے۔ ہر اجتماع کے موقعہ پر بک اسٹال بھی لگائے جائیں گے۔ معززین شہر کے نام دعوت نامے جاری کئے جارہے ہیں۔

راولپنڈی الکوثر کے ہفتہ وار اجتماعات میں ٹیپ ریکارڈز کے ذریعہ پرویز صاحب کی تازہ بتازہ تقاریر سنائی جارہی ہیں۔ اور احباب ان اجتماعات میں پورے ذوق و شوق سے حصہ لے رہے ہیں۔

واہ فیکٹری ایریا میں بھی پرویز صاحب کی تقریر کا ٹیپ ریکارڈ سنایا گیا۔ اور مقامی معززین کی ایک بڑی تعداد نے اسے جذب و انہماک سے سنا۔ مری کے احباب کی دعوت پر ۲۵۔ ۲۶ تاریخ کو وہاں بھی کئی اہم مجالس میں یہ ٹیپ ریکارڈ کی تقاریر سنائی گئیں۔ ایمبسڈر ہال کا اجتماع بالخصوص اصحاب علم و فکر پر مشتمل تھا۔ خواتین کی مجالس بھی بڑی کامیاب رہیں۔ رفیق عزیز سبحانی مرحوم کی وفات پر اظہار تعزیت کیا گیا۔ (بزم راولپنڈی کا دفتر گورنمنٹ زنانہ کالج مری روڈ کے بالکل سامنے کچی سڑک پر (الکوثر بلڈنگ میں) واقع ہے)

مردان بزم کے حالیہ اجلاس میں محترم رفیق سبحانی صاحب مرحوم کے حق میں دعائے مغفرت اور پسماندگان مرحوم سے اظہار تعزیت کیا گیا۔ کتابوں، رسالوں اور پمفلٹوں کو خواندہ اصحاب تک پہنچانے کا کام پوری باقاعدگی سے جاری ہے۔ بعد ازاں ان اصحاب سے تبادلہ خیالات بھی کیا جاتا ہے۔ طلوع اسلام کے سالانہ خریدار بڑی تعداد میں مہیا کئے جارہے ہیں۔ کرسیوں اور شامیانوں کے سلسلہ میں موعودہ رقم بہت جلد ارسال کردی جائے گی۔ درس قرآن کا سلسلہ باقاعدہ جاری ہے۔ اس وقت سورۂ نمل (انیسواں پارہ) زیر مطالعہ ہے

ملتان بزم کی تشکیل مئی میں ہو چکی تھی لیکن مرکز کی طرف سے اس کی منظوری میں تاخیر بزم کی سرگرمیوں میں باعث تعطل بنی رہی۔ اختر حسین صاحب ایڈووکیٹ کے باہر جانے کے باعث محترم غلام محی الدین خاں بزم کے نمائندہ منتخب ہوئے ہیں۔ یہاں کے کافی معززین بزم کے رکن بننے کے خواہشمند ہیں لیکن بزم کی منظوری میں تاخیر اور قرطاس رکنیت نہ ملنے کی وجہ سے یہ کام رکا رہا۔ اب کام آگے چل پڑے گا۔

گوجرانوالہ گذشتہ دو ہفتہ وار اجتماعات میں مقامی احباب کے علاوہ سکھیکی، نظام آباد۔ نت کلاں اور دیگر علاقوں کے معززین اور احباب بھی شریک ہوتے رہے۔ یہاں کے دو مقامی معززین نے اس ہفتہ بزم کی رکنیت اختیار کی۔ گذشتہ ڈیڑھ ماہ میں دو صد کے قریب پمفلٹ تقسیم کئے گئے اور چھ نئے خریدار

طلوع اسلام کے بنائے گئے ہیں۔ صاحب ذوق اصحاب کو کتابیں بھی برائے مطالعہ دی گئی ہیں۔ اور انھیں بہت پسند کیا گیا ہے۔

چنیوٹ (ضلع جھنگ) بزم کا گذشتہ اجلاس یہاں شاہی مسجد کے پائیں باغ میں ہوا۔ بزم کے حلقہ اثر کو بڑھانے اور تحریک کو فروغ دینے کے لئے پروگرام مرتب کیا گیا۔ جریدہ طلوع اسلام کے خریدار بڑھانے پر بھی غور کیا گیا۔

پشاور (صدر) راولپنڈی کے ٹیپ ریکارڈز سے پرویز صاحب کی تقاریر یہاں کے اہل علم اصحاب کے اجتماعات میں سنائی گئیں جو بڑی اثر انگیز ثابت ہوئیں۔ بزم نے اپنے گذشتہ اجلاس میں رفیق عزیز سجانی مرحوم کی وفات پر ایک تعزیتی قرارداد میں پرویز صاحب اور لواحقین مرحوم سے ہمدردی اور تعزیت کا اظہار کیا۔

پشاور (شہر) گذشتہ کنونشن کے فیصلوں کی تعمیل میں اراکین بزم کو ہدایات دیدی گئی ہیں۔ طلوع اسلام کے خریدار بنانے کی کوششیں جاری ہیں۔

پنڈدادنخاں (ضلع جہلم) ادارہ طلوع اسلام کے مقاصد کی نشر و اشاعت کا کام سرگرمی سے جاری ہو۔ کتابیں اور پمفلٹ برائے مطالعہ باقاعدگی سے تقسیم کئے جارہے ہیں۔

سید حسین (ضلع جہلم) بزم اپنے ارکان کی مختصر تعداد کے باوجود قرآنی فکر کی نشر و اشاعت میں سرگرم کار ہے۔ اراکین بزم کے لئے ناسازگار حالات پیدا کئے جارہے ہیں لیکن بزم کا ہر رکن اپنی سیرت و کردار کو اسوۂ رسولؐ سے قریب تر لانے کی جدوجہد میں چٹان کی طرح ثابت قدم ہے۔

مری (ضلع راولپنڈی) بزم کے اجلاس باقاعدگی سے ہو رہے ہیں۔ ۲۵ اور ۲۶ جولائی کے خصوصی اجتماعات بڑے کامیاب رہے۔ ایمبیڈر ہال کا اجتماع خاص طور پر کامیاب رہا۔ جہاں ایک سو کے قریب اہل علم اصحاب نے ٹیپ ریکارڈ سے پرویز صاحب کی دلنشیں تقاریر سنیں۔ بزم کے اجلاس میں پہلے سے طے شدہ موضوع زیر بحث لایا جاتا ہے جس سے ہفتہ وار اجلاس کی افادی حیثیت بڑھ گئی ہے۔ مخالفین نے بھی اپنی مخالفانہ حرکات کا آغاز کر رکھا ہے۔ تاکہ مسلمان قرآن کا پیغام سننے نہ پائے۔

ٹنڈو محمد خاں (ضلع حیدرآباد) ۲ اگست کو یہاں بزم کا ہفتہ وار اجلاس ہوا۔ جس میں ہمارا مستقبل کے موضوع پر احباب بزم نے تقاریر کیں۔ قرآنی دستور کے نفاذ کے سلسلہ میں فضا کو سازگار بنانے کے لئے نئے عزائم کے ساتھ سرگرم کار ہونے کا فیصلہ کیا گیا۔ چند احباب سے دو معززین نے بزم کی رکنیت قبول کی۔ بزم، طلوع اسلام کے پرچے بھی تقسیم کر رہی ہے۔

سیالکوٹ بزم کا ہفتہ وار اجلاس باقاعدگی سے ہوتا ہے۔ اس اجلاس میں مختلف موضوعات زیر غور لائے جاتے ہیں اور قرآن کی روشنی میں افہام و تفہیم کی کوشش کی جاتی ہے۔

مصر کے عظیم مفکر اور حقیقت نگار

علامہ ڈاکٹر طٰہٰ حسین

کی

مشہور تصنیف

الفتنۃ الکبریٰ

(اردو میں)

حضرت عثمانؓ کی شہادت اور اسکے محرکات و پس منظر پر محققانہ تبصرہ

صفحات :- ۵۴۰

قیمت مجلد :- چھ روپے

اس پتہ سے منگوایئے

ادارہ طلوع اسلام ۲۵۔بی۔ گلبرگ لاہور

مطبوعات ——— اور ——— پمفلٹس

۱- اسباب زوالِ امت (صفحات ۱۷۶) قیمت -/۲
۲- اسلامی معاشرت (" ۱۹۲) " -/۲
۳- قرآنی فیصلے (" ۴۰۸) " -/۴
۴- اسلامی نظام (" ۱۸۱) " -/۲
۵- قرآنی دستور پاکستان (" ۲۲۴) " ۲/۸/-
۶- مزاج شناسِ رسول (" ۴۴۸) " -/۴
۷- جشن نامے (" ۲۵۶) ۲/۸/-
۸- سلیم کے نام خطوط (حصہ اول) (" ۳۲۴) -/۸
۹- ابلیس و آدم (بڑی تقطیع) (" ۳۷۶) -/۸
۱۰- اقبال اور قرآن -/۲
۱۱- معراجِ انسانیت (بڑا سائز) -/۲۰
۱۲- نظام ربوبیت (") -/۵
۱۳- جوئے نور (صفحات ۳۰۴) -/۶
۱۴- برقِ طور (" ۳۲۰) -/۶
۱۵- شعلۂ مستور (" ۲۷۲) -/۶
۱۶- طاہرہ کے نام خطوط (حصہ اول و دوم) قیمت -/۸/۴
۱۷- انسان نے کیا سوچا؟ (زیر طبع)
۱۸- نوادرات (صفحات ۲۹۹) قیمت -/۴
۱۹- جمع القرآن " -/۱
۲۰- اسلام میں قانون سازی کا اصول " ۲/۸
۲۱- من و یزداں " -/۱۰
۲۲- الفتنۃ الکبریٰ " -/۶

ادارہ طلوع اسلام کی جملہ مطبوعات بلا محصول ڈاک؟

تفصیل کیلئے کارڈ لکھئے

فی پمفلٹ ۴ر

پیامِ فصلِ بہار۔ قانونِ شریعت۔ مقام محمدی۔ یتیم پوتے کی وراثت۔ دستور پاکستان اور طلوع اسلام (انگریزی)، ہماری تاریخ۔

فی پمفلٹ ۳ر

من و یزداں۔ پاکستان میں قانون سازی کا اصول۔ بادۂ زندگی۔ سنت رسول اللہ۔ خمِ زندگی۔

فی پمفلٹ ۲ر

خود فیصلہ کیجئے۔ رحمۃ للعالمین۔ قوموں کے تمدن پر جنسیات کا اثر۔ اطاعتِ رسولؐ۔ یہ زمین کس کی ہے؟ فرقے کیسے مٹ سکتے ہیں؟ انتخاب۔ علماء کون ہیں؟ تقدیر امم۔ تکذیب دین کون کرتا ہے۔ اندھے کی لکڑی۔ معاشی نظام اور اسلامی دستور کے بنیادی اصول (انگریزی)

فی پمفلٹ

قرآنک سوشل آرڈر۔ مقام اقبال۔ پیام اقبال۔ لمعات۔ دینِ خداوندی۔ افواہیں۔ نعرۂ تکبیر۔